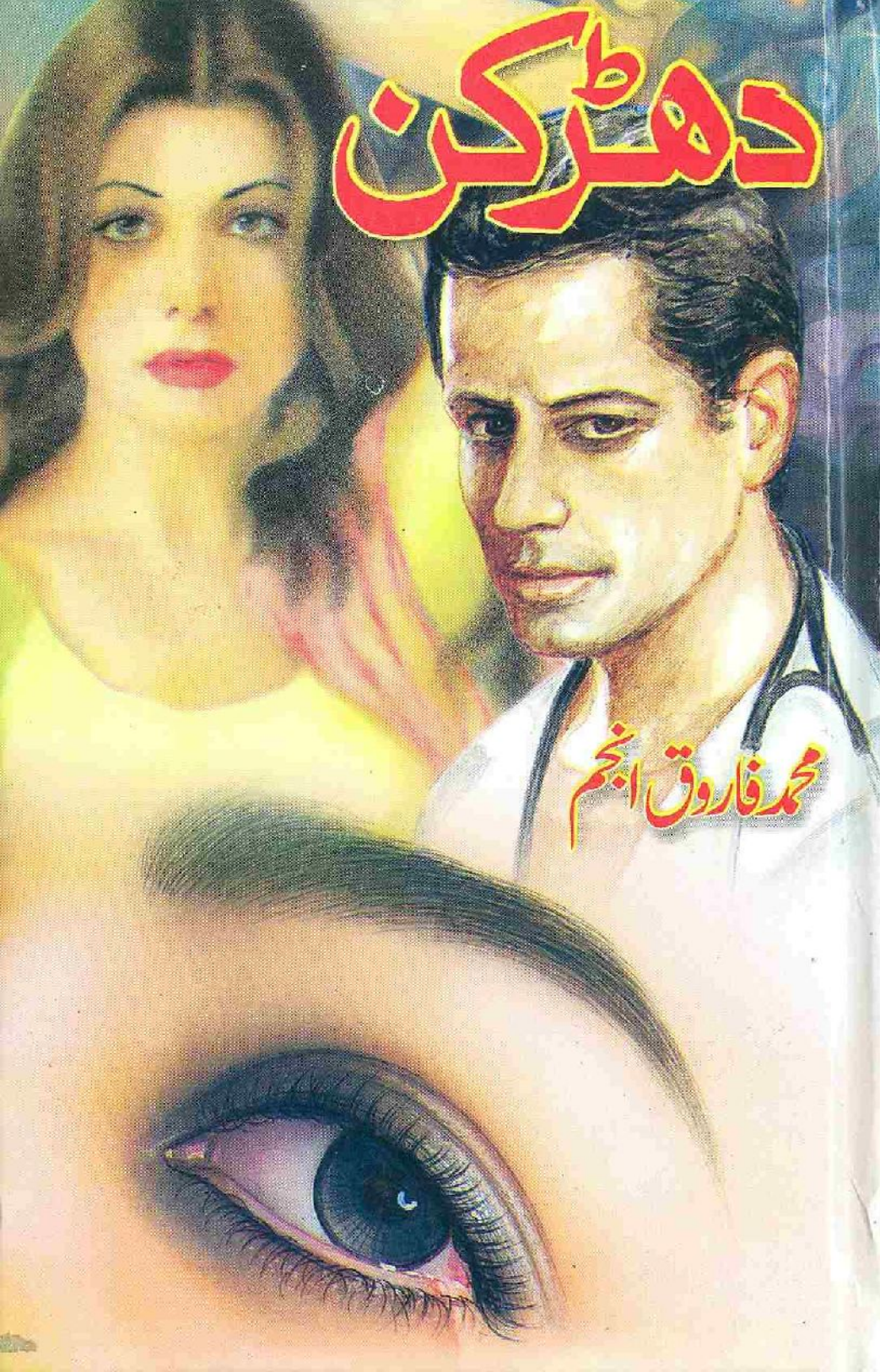


# دھڑکن

محمد فاروق انجم



# دھڑکن

محمد فاروق انجم  
تدوین

نواب سنز پبلی کیشنز

اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی

با وقار اور نفاست پسند قارئین کے لئے پر وقار اور نفیس ترین کتابیں



## پیش لفظ

— ضابطہ —

حقوق اشاعت محفوظ ہیں

محترم قارئین!

”دھڑکن“ کے نام سے نواب سنز پبلی کیشنز راولپنڈی کے زیر اہتمام شائع ہونے والا یہ میرا دوسرا ناول ہے۔

”دھڑکن“ ہفت روزہ اخبار جہاں میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ محبت کی کہانی ہے۔ محبت ایک ایسا پھول ہے جو دل کی سرزمین پر کب کھل جاتا ہے اس کا پتا بھی نہیں چلتا ہے۔ دل کی دھڑکن رفتہ رفتہ یہ محسوس کراتی ہے کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔ دل کی زمین محبت سے آشنا ہو گئی ہے۔

میرے ناول دھڑکن میں بھی کچھ ایسے ہی احساسات آپ کو پڑھنے کے لیے ملیں گے۔ ایک چھوٹے سے واقعہ سے شروع ہونے والی یہ کہانی محبت کے مضبوط رشتے میں تبدیل ہو کر کیا رنگ دکھاتی ہے یقیناً جب آپ اس کہانی کو پڑھیں گے تو آپ کے دل میں بھی محبت کا احساس روشنی دیے کی طرح چمکنے لگے گا۔ اس کہانی کے سبھی کردار دلچسپ ہیں۔

کہانی میں آپ کو مزاح کے پھول بھی دکھائی دیں گے اور محبت کے

ناشر	اعجاز احمد نواب	حروف آرائی	میٹرکس کمپوزرز
طابع	نواب سنز پبلی کیشنز	سرورق	ڈیزائن ماسٹر
مطبع	زیرو پوائنٹ	اشاعت	۲۰۱۲ء



Retail Price  
Rs. 300/-

— رابطہ —

## نواب سنز پبلی کیشنز

اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی Ph: 051-5555275

ڈسٹری بیوٹر اشرف پکٹ اپنی کمیٹی چوک اقبال روڈ راولپنڈی فون 051-5772306



احساس سے جو درد پیدا ہوتا ہے اس کی جھلک بھی پڑھنے کو ملے گی۔

کچھ دل ایسے بھی ہوتے ہیں جو پتھر کی طرح سخت ہوتے ہیں۔ ان کی سوچیں سنگلاخ ہوتی ہیں۔ یہ محبت ہی ہے جو دل کو پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک کرتی ہے۔

محبت کی اس کہانی کو محبت سے پڑھ کر مجھے اپنی آراء سے ضرور نوازیں۔

شکریہ

.....

فاروق انجم

امیر گروپ آف انڈسٹریز کے بانی اور چیئرمین امیر احمد خان نے اپنی ساری جائیداد اپنے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں میں منقسم کی تو اس نے اپنے بچوں کو یہ ہدایت ضرور کی تھی کہ وہ کبھی بھی ایسا یونٹ لگانے کی کوشش نہ کریں کہ جس سے وہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے مارکیٹ میں مقابلہ کرتے ہوئے الجھتے رہیں۔ اپنے ہر اگلے پراجیکٹ کے لیے ایک دوسرے سے ضرور مشاورت کر لیا کریں۔ اپنے باپ کی اس وصیت کو سب نے اپنے پلو سے باندھ لیا تھا۔ اسی لئے سب بھائیوں کے کاروبار الگ الگ ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے لیے کہیں بھی مارکیٹ میں مقابلے بازی کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ ان کا اتفاق ہر جگہ مشہور تھا۔

امیر احمد خان نے انڈسٹریز کا جو پودا لگایا تھا وہ پھل پھول کر ایک بہت بڑے گھنے درخت کی سی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ امیر احمد خان کے بیٹوں کی اولادیں اس گھر میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ دولت کی ریل پیل میں غربت کیا ہوتی ہے، کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ وہ مہنگے علاقوں میں رہتے تھے، مہنگی کاریں استعمال کرتے تھے، لاکھوں اپنے کپڑوں پر خرچ کر دیتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں کو وہ سوکھے پتوں کی طرح کچل کر تو وہ گزرتے ہی تھے، خاندان کے اگر کسی فرد نے اپنی مرضی سے شادی کر لی، بتانے پر دعوتِ ولیمہ کی خاندان بھر میں تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں، کس نے اپنے شوہر سے طلاق لینے کے لیے عدالت سے



رجوع کر لیا اور کس نے کب اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی کسی لڑکی یا لڑکے کو خاندان میں یا خاندان سے باہر کوئی پسند آ جاتا تھا تو اس کے اظہار کے لیے تمہید کی قطاریں نہیں باندھی جاتی تھیں۔ ایسی تمام باتیں ان کے لیے ایسی حیثیت نہیں رکھتی تھیں کہ جس سے وہ متانت کی تصویر دکھائی دیے لگیں۔ سب اپنی اپنی زندگی جی رہے تھے اور خوش و خرم تھے۔

امیر احمد خان کا سب سے چھوٹا بیٹا فیاض احمد خان کے گھر کا ماحول قدرے مختلف تھا۔ اپنے بھائیوں اور خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اس کے چہرے پر ہر وقت بڑے لوگوں جیسی سنجیدگی اور دماغ ہر وقت پیسہ کمانے کی سوچ میں مستغرق نہیں رہتا تھا۔ وہ مسکراتا بھی تھا اپنی زبان سے کئی شگفتہ جملے بھی کہہ دیتا تھا اُسے غریب کی بھی پہچان تھی اس کے دل میں احساس بھی تھا اپنی اولاد ان کی بیویوں اور بچوں کے ساتھ اس کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔

فیاض احمد کی بیوی نگہت بیگم کا تعلق بھی ایک بہت امیر کبیر خاندان سے تھا۔ کچھ بھی اُسے بڑی مشکل سے پسند آتا تھا۔ ہر وقت ناک پر ایک سنجیدگی اور ماتھے پر ایک ایسی سلوٹ رہتی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی کو بھی خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اپنی زبان سے نکلا کوئی بھی جملہ وہ حرفِ آخر خیال کرتی تھی جیسے پتھر پر اُس نے لکیر کھینچ دی ہو۔ اُس کا لہجہ تحکمانہ سا ہوتا تھا۔ کوئی بھی جب اس کی بات کو رد کرنے کی جرأت کر دیتا تو پھر جیسے اپنی بات کو منوانے کے لیے وہ ایک چٹان کی مانند ہو جاتی تھی ضد کی ایسی مورتی بن جاتی تھی کہ گوشت پوست کی تو لگتی ہی نہیں تھی۔ وہ بہت کم مسکراتی تھی۔ مسرت کی پٹیاں اس کے چہرے پر تب ہی واضح دکھائی دیتی تھیں جب اس کی بات پوری ہوتی تھی۔ تب وہ کسی فاتح کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ نگہت بیگم کو تمکنت اکڑی ہوئی گردن اور تحکمانہ لہجہ اپنے خاندان سے وارثت میں ملا تھا۔

فیاض احمد کے مزاج اور نگہت بیگم کی عادت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ فیاض احمد نے اس کے ساتھ زندگی کا ایک حصہ ہنس کر، مسکرا کر اور گزاردیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گھر داری میں دخل اندازی نہ کرنے کا نگہت بیگم نے فیاض احمد سے عہد لیا ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھر کی گاڑی عورت کی حکمت سے چلتی ہے اور بزنس مرد کی دانشمندی سے۔ نگہت بیگم کے سامنے وہ زیادہ تر چپ ہی رہتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں مسکراتی اور بولتی رہتی تھیں۔ زیر لب کئی

چٹکے نکل جاتے تھے۔ اُس کے سامنے بولنے اور کچھ کہنے کے لیے پتہ نہیں کیوں وہ بھیگی بلی کی طرح رہتا تھا۔

خاندان کے کچھ افراد نے ایک آدھ بار بات کی تھی کہ فیاض احمد اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔ یہ سچ بھی تھا۔ وہ نگہت بیگم کے سامنے کچھ دبا دیا رہتا تھا۔ اس کی وجہ پتہ نہیں نگہت بیگم کی شخصیت تھی فیاض احمد کو کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا یا اپنے سر کا بہت بڑا سیاست دان ہونا تھا۔ جس کے تعلقات درخت کی جڑوں کی طرح دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت اپنی جگہ تھی کہ جتنا اچھا وہ بزنس مین تھا اس کے برعکس وہ گھر میں شادی سے پہلے بھی کسی کے ساتھ گھر کے فیصلوں میں بولنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

فیاض احمد کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا اولیس احمد خان تھا۔ اس کی بیوی منال تھی۔ دوسرا بیٹا کا شان احمد خان تھا۔ اس کی بیوی کا نام سبینا تھا۔ دونوں بیٹے کاروبار میں اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ بیٹوں کی شادی اُسی جگہ ہوئی تھی جہاں نگہت بیگم نے کہا تھا اور چاہا تھا۔ دونوں بہویں نگہت بیگم کے خاندان سے تھیں۔

فیاض احمد کا تیسرا بیٹا عاشر احمد خان تھا۔ وہ باپ کی کاربن کاپی تھا۔ ہنستا تھا، مسکراتا تھا، شرارت اور شگفتگی اس کی رگوں میں تھی۔ اُس نے دولت کی ریل پیل دیکھی تھی لیکن دل میں کوئی تکبر، گھمنڈ اور ایسی بات نہیں تھی کہ احساس کے لیے جگہ ہی نہ بچتی۔ وہ بھی کاروبار کا ایک حصہ تھا۔ اپنے دل کی بات اگر وہ محسوس کرتا تو باپ سے ضرور کر لیتا تھا۔ عاشر کی ایک عادت باپ پر نہیں گئی تھی اور وہ تھی چپ رہنے کی عادت۔ اپنی پسند اور ناپسند پر وہ ہاں اور ناں کرنے میں خاموشی کا سہارا نہیں لیتا تھا۔ فیاض احمد اپنے اس بیٹے کو دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی چاہتا تھا۔ اس گھر میں عاشر ہی ایک تھا جس کی نہ تو کہیں شادی کے لیے بات چلی تھی اور نہ ہی اُس کے دل میں کسی ایسی لڑکی نے جگہ بنائی تھی کہ وہ اس کی دستک اپنی روح اور دل کی ہر دھڑکن تک محسوس کرتا۔ لیکن فیاض احمد جانتا تھا کہ نگہت بیگم عاشر کے لیے کہاں اپنی لگائیں مرکز کے بیٹھی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس لڑکی کے بارے میں جان کر عاشر کے منہ سے ہاں نہیں نکلے گی اور نگہت بیگم کی مجبوری ہے کہ وہ انکار سن نہیں سکتی تب گھر میں ہوتا ہوا تصادم بھی

دھڑکن  
فیاض احمد چشم تصور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ چپ تھا وہ قبل از وقت کچھ کہنا مناسب خیال نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ نگہت بیگم کا بھروسہ نہیں تھا اس کا ارادہ بدل بھی سکتا تھا۔ نظر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر بھی جاسکتی تھی۔ ابھی تو اس نے محض اس لڑکی کے بارے میں فیاض احمد سے اشاروں میں ہی بات کی تھی۔

☆.....☆.....☆

اُس دن شام سے کچھ دیر قبل جب نگہت بیگم اور فیاض احمد اپنے بنگلے کے وسیع لان میں براجمان چائے پی رہے تھے تو نگہت بیگم نے چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

”کیسا فیصلہ؟“ فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھا۔

”عاشر کے لئے صبا سے اچھی لڑکی کوئی اور نہیں ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

جانتے ہوئے بھی فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اُس کی۔۔۔ آفس سیکرٹری کیلئے؟“

”فیاض تمہیں کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے۔“ نگہت بیگم نے اس کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو جاتا ہے؟“ فیاض احمد نے بھولے پن سے پوچھا۔

”صبا سینکڑوں سیکرٹریاں خرید سکتی ہے اور تم اس کے سیکرٹری بننے کی بات کر رہے ہو۔“ نگہت بیگم کو غصہ آ گیا تھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ یکدم فیاض احمد نے چونک کر اپنے ماتھے پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ ”تم صبا عظیم کی بات کر رہی ہو۔ میں کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا تھا۔ ایم سوری.... تو کیا فیصلہ کیا تم نے اس کے بارے میں؟“

نگہت بیگم نے پہلے تو کچھ دیر اپنا مزاج ٹھیک کرنے میں لگائی اور پھر بولی۔ ”میں صبا کو اپنی تیسری بہو بنا کر اس گھر میں لانا چاہتی ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

دھڑکن  
فیاض احمد نے خالی چائے کا کپ میز پر رکھا اور کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ سوال تمہیں عاشر سے کرنا چاہئے۔“

نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہاری کیا رائے ہے؟“  
”لیکن تم تو پہلے عاشر کے لیے اُس کے بارے میں کہہ رہی تھی کیا نام ہے اس کا.... ہاں کرن۔“ فیاض احمد نے بہانے سے اُس لڑکی کے بارے میں کہہ دیا جسے وہ صبا سے اچھی لڑکی سمجھتا تھا۔

”کرن...؟ میں نے کب اس کے بارے میں کہا تھا۔“ نگہت بیگم نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”تم نے اپنی رائے نہیں بتائی۔“

فیاض احمد مسکرایا۔ ”جب فیصلہ کر لیا جائے تو پھر کسی کی رائے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ رائے کی جگہ تو فیصلے سے پہلے ہوتی ہے۔“

”ہم میں یہ بات پہلے دن سے طے تھی کہ تمہارے بزنس کی اونچ نیچ میں میں کبھی دخل اندازی نہیں کروں گی اور تم گھر کے معاملے میں نہیں بولو گے۔“ نگہت بیگم نے جیسے یاد دلایا ہو۔

”یہ تمہارا بڑا پن ہی تو ہے کہ تم نے اس معاہدے کے باوجود مجھ ناچیز سے رائے طلب کی۔“ فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھ کر ایک مسکراہٹ یوں چھوڑی جیسے کوئی کمان سے تیر چھوڑتا ہے۔ اور اُس دن کو کو سا جب اس نے وسیع تر مفاد کے لیے ایسا معاہدہ کیا تھا۔

”کیسا لگا تمہیں میرا فیصلہ؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے یہ ہی پوچھنا چاہتی تھیں۔ رائے لینے کی بات تو شاید یونہی اتفاقہ کہہ دی تھی آپ نے۔“ فیاض احمد بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ مسکراتے ہوئے کہہ ہی دیتا تھا۔

نگہت بیگم پہلی بار مسکرائی۔ ”فیاض تم اپنی باتوں سے باز نہیں آتے۔“

☆.....☆.....☆

دھڑکن

پھر نگہت بیگم نے اپنے دونوں بیٹوں اور ان کی بیویوں کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ نگہت بیگم کے فیصلے پر کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صبا عظیم ایک بڑے خاندان کی بیٹی تھی۔ مناہل اور سیدہ کے خاندان کے برابر کی تھی۔ وہ خوبصورت تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ اُس نے امریکہ جیسے ملک میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کے فیصلے ہمیشہ خود کئے تھے۔ اس کی سوچ دوسروں سے الگ تھی۔ وہ ایک گھمنڈی انا پرست اور مغرور لڑکی تھی۔ جسے فیاض احمد بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

اُس کے باپ کا بزنس اس ملک میں ہی نہیں بلکہ کئی دوسرے ممالک میں بھی پھیلا ہوا تھا جس کی دیکھ بھال اس کے بھائی بھی کرتے تھے۔ صبا عظیم نگہت بیگم کے بڑے بھائی کی بیٹی تھی۔ نگہت بیگم کو اپنا بھائی اور بھائی کو اپنی بہن بہت عزیز تھی۔

”آپ نے عاشر سے بات کر لی ہے ماما؟“ اولیس احمد نے پوچھا۔

”اب اسے ہی بتاؤں گی۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ بات سن کر خوش ہو جائے گا۔“ مناہل نے مسکرا کر کہا۔ ”صبا بہت مختلف لڑکی ہے۔“

کا شان نے کہا۔ ”عاشر بھی کیا کم مختلف ہے۔ وہ بھی اس خاندان کا ایک نایاب ہیرا ہے۔“

”ماما... عاشر کی پہلے منگنی ہوگی اور پھر شادی۔ تاکہ ہماری فیملی میں کئی دنوں تک خوشیوں کی جگمگ ہوتی رہے۔“ سیدہ نے کہا۔

نگہت بیگم خوش ہو کر بولی۔ ”جیسا تم لوگ کہو گے دیا ہی ہوگا۔“

”ویسے تم نے عاشر کی بات اپنے بھائی سے کی ہے کہ خود ہی اپنی طرف سے ترکش سے تیر نکال نکال کر چھوڑے جا رہی ہو۔“ پاس ہی فیاض احمد بھی تھا اس نے پوچھا۔

”میری بات اُن سے ہو چکی ہے۔ وہ تو سنتے ہی خوشی سے جھوم اُٹھے تھے۔ اُنہوں نے ہاں کر دی ہے۔ ویسے بھی میرا بھائی میری کوئی بات بھی نہیں ٹالتا۔“ نگہت بیگم نے زعم سے کہا اور مسکرائی۔

دھڑکن

”تو پھر اب جلدی سے آپ عاشر سے بات کر لیں۔“ مناہل نے خوشی سے کہا۔

”سمجھو اس سے بات ہو چکی ہے۔ وہ میری بات سن کر انکار تھوڑی کرے گا۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”ہاں انکار نہیں کر سکتا ہے۔ وہ کیوں انکار کرے گا۔“ فیاض احمد نے کہا جیسے وہ بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا تو اس کی طرف داری کر رہا ہو۔

”اولیس تم عاشر کو فون کرو کہ وہ جہاں بھی ہے وہ ابھی گھر آ جائے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”تم سب جمع ہو اس لئے بات ہو جائے تو اچھا ہے۔“

”اگر تم یہ بات کرنے کے لیے دو دن رک جاؤ تو۔“ فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ کیوں؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”دو دن بعد ہمارے ایک نئے دفتر کا افتتاح ہے۔ جہاں وہ بیٹھ کر کام کرے گا۔ اس دن اُسے ڈبل خوشی مل جائے گی۔“ فیاض احمد نے کہا۔

نگہت بیگم نے اس کی بات سن کر اپنے بیٹوں اور بہنوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر بولی۔ ”ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”لیکن دفتر کا افتتاح تو کل ہے ڈیڈ۔“ اچانک اولیس احمد نے کہا۔

”کل ہے؟“ فیاض احمد کو یہ ڈر تھا کہ اس کی پرسوں افتتاح والی بات پر اس کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور بولے گا۔

”ہاں کل ہے۔ آپ نے ہی تو تاریخ اناؤنس کی تھی۔“ کا شان احمد نے بھی تصدیق کر دی۔

”تو پھر کل ہی ہوگی۔“ فیاض احمد نے اس تصدیق کے بعد کہا۔ نگہت بیگم کی نگاہیں فیاض احمد کی طرف مرکوز تھیں۔

☆.....☆.....☆

عاشر کے بہت سے دوستوں میں ایک خاور بھی تھا۔ خاور کا باپ ایک نجی ادارے میں



ملازمت کرتا تھا۔ عاشق کی خاور کے ساتھ دوستی یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ دونوں کے دل ایسے ملے تھے کہ وقت کے ساتھ ساتھ دوستی بہت گہری ہو گئی تھی۔ خاور کبھی اس کے گھر میں نہیں گیا تھا۔ دوستی باہر اور عاشق کے دفتر تک گھومتی تھی۔ عاشق جانتا تھا کہ وہ اپنے خاندان کا پہلا لڑکا ہے جس کی دوستی کسی عام گھرانے کے فرد کے ساتھ ہے۔ اور اگر اس کا علم اس کی ماں نگہت بیگم کو ہو گیا تو شاید وہ خاور کو کالے پانی کی سزا دلادے۔ عاشق کو خاور میں بہت سی خوبیاں اچھی لگتی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ خاور نے کبھی اس کے امیر ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ اُس نے تو کبھی اس سے نوکری بھی نہیں مانگی تھی۔ حالانکہ عاشق نے یونیورسٹی میں ہی کئی بار کہہ دیا تھا کہ اُسے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی روزگار کے لیے بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی وہ اپنی کسی بھی کمپنی میں اُسے نوکری دلادے گا۔ خاور نے یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی عاشق کی کسی بھی ایسی پیشکش کی طرف بھاگنے کی بجائے خاموشی سے اپنے طور پر کہیں اور ہی نوکری کی تلاش شروع کر دی تھی اور اس کی قسمت اچھی کہ خاور کو ایک نچی فوڈ کمپنی میں مارکیٹنگ سیلز کی اچھی نوکری مل گئی تھی۔

عاشق کو جب اس بات کا علم ہوا تھا تو اس نے متحیر ہو کر پوچھا تھا۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟“

”کیا کیا؟“ خاور نے بھی اس کی طرف حیرت سے دیکھا تھا۔

”تم نے نوکری کر لی۔“ عاشق نے کہا۔

”مجھے کسی نے بتایا تھا کہ مجھے وزارت ملنے والی ہے۔“ اس بار خاور نے اور بھی حیرت

کا اظہار کیا تھا۔

”میں نے تجھے کہا تھا کہ میری کسی بھی کمپنی میں کام کرنا۔ ہم ایک ساتھ مل کر کام کرتے۔“ عاشق نے کہا تھا۔

”بات یہ تھی کہ اس کمپنی کا جنرل مینجر میرے ابو کے بہت پرانے دوست ہیں۔ ابو نے

پہلے ہی ان سے بات کر لی تھی۔ جنرل مینجر صاحب نے فوراً ہاں کر دی اور اب مجھے ابو کی بھی

بات رکھنی تھی۔ لیکن تم فکر نہیں کرو۔ مجھے جلد ہی اپنی نالائقوں کی وجہ سے نوکری سے نکال دیا

جائے گا۔ پھر میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“ خاور نے ایک کہانی گھڑ کر سنا دی تھی۔ عاشق اس

کی بات سن کر مسکرا دیا تھا۔

چند مہینوں کے بعد ہی کمپنی والوں نے خاور کی کارکردگی دیکھتے ہوئے ایک چھوٹی کار بھی

اُسے دے دی۔ جب عاشق نے خاور کو کار میں بیٹھا دیکھا اور خاور نے بتایا کہ یہ کار اُسے کمپنی

نے دی ہے تو عاشق نے کہا۔ ”تم نے تو کہا تھا کہ وہ تمہیں جلد نوکری سے نکال دیں گے۔“

”میرے جونیئر کو انہوں نے ترقی دے کرنی زیر و میسر کار دے دی اور مجھے یہ پرانی کار

دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جی ایم صاحب ابو کا لحاظ کر رہے ہیں۔ اس لئے وہ مجھے مجبور کر رہے

ہیں کہ میں ایسی باتوں سے تنگ آ کر خود ہی نوکری چھوڑ دوں۔ آؤ میں تمہیں کھانا کھلاتا ہوں۔“

”تم مجھے ریسٹورنٹ تک لے جاؤ میں کھانا کھا خود ہی لوں گا۔“ عاشق نے مسکرا کر کہا تھا

اور پہلی بار کسی سستی اور سیکنڈ ہنڈ کار میں وہ بیٹھا تھا۔ ویسے خاور نے عاشق کو بہت سے کام پہلی بار

کرائے تھے جو اس کے خاندان کی نو جوان نسل تو بالکل ہی نہیں کرتی تھی۔ خاور نے فٹ پاتھ

پر لگی نان چنوں کی ریڑھی سے کھڑے ہو کر ایک بار ناشتہ بھی کرایا تھا جو عاشق کو بہت پسند آیا

تھا۔ ایک بار رات کو جب وہ دونوں چہل قدمی کر رہے تھے تو ایک طرف لگی سبز چائے کی ریڑھی

سے دو کپ لے کر خاور نے وہ چائے بھی پلوائی تھی، جون کی ایک سخت دوپہر کو خاور نے گنے کا

رس بھی ریڑھی سے عاشق کے ساتھ مل کر پیا تھا۔ اور تو اور خاور کے محلے کی کرکٹ ٹیم جب میچ

کھیلنے والی تھی اور ان کا ایک بلے باز اچانک کہیں کام سے چلا گیا تھا تو خاور نے عاشق کو اس کی

جگہ کھیلنے کے لیے کہا تھا۔ جہاں میچ ہو رہا تھا وہاں گھاس بھی تھی اس کے ساتھ مٹی اور ڈھول بھی

تھی۔ جب وقفہ ہوا تھا تو پوری ٹیم نے ایک ریڑھی والے سے شکر قدمی کی چارٹ کھائی

تھی۔ عاشق تب بھی بہت لطف اندوز ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اس نے اپنی کلاس

سے باہر نکل کر دیکھا اور لطف اٹھایا تھا۔

اُس رات بھی عاشق اس کے ساتھ ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں بیٹھارات کا کھانا کھا رہا

تھا۔ وہ کھانا عاشق کی طرف سے تھا۔ فیاض احمد کی کوشش تھی کہ وہ اس سے رابطہ کر کے یہ بتانے

میں کامیاب ہو جائے کہ اس کی ماں اس کی زندگی کا کیا فیصلہ کئے بیٹھی ہے تاکہ اچانک ماں

کے منہ سے اس کا فیصلہ سن کر دم بخود ہو جانے کی بجائے اس کے دماغ میں اس کا حل یا مناسب

جواب ہوتا کہ گھر میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو سکے۔

پوری کوشش کرنے کے باوجود فیاض احمد کو موقع نہیں مل رہا تھا کہ وہ عاشر سے فون پر رابطہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے اور وہ ان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک دو بار اُس نے کسی بہانے سے اُٹھنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ اُٹھ نہیں سکا۔ عاشر بے فکری سے کھانا کھانے میں لگن تھا۔

”کل میرے نئے آفس کا افتتاح ہے۔“ عاشر نے کھانے کے دوران خاور سے کہا۔

”مبارک ہو۔“ خاور نے مسکرا کر کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی نوکری چھوڑ دو۔“ عاشر نے کہا۔

”تمہارے نئے آفس کے افتتاح کی خوشی میں۔؟“ خاور نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ تم میرے ساتھ کام کرو۔“ عاشر نے وضاحت کی۔

”تم وہاں کیا کام کرنے والے ہو۔؟“ خاور نے پوچھا۔

”جو میں کرتا ہوں۔“ عاشر نے جواب دیا۔

”وہ تو تم اکیلے بھی کر سکتے ہو۔ فائلوں پر دستخط کرنا، حکم دینا، کافی پینا، وغیرہ وغیرہ۔“

خاور نے کہا۔

”میں نے تمہارے لئے ایک کرسی کا انتظام کیا ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”وہ کرسی تم مجھے دے دینا۔ میں اُس پر اپنے گھر بیٹھ جایا کروں گا۔“ خاور نے جھٹ سے

کہا۔

عاشر جھلا گیا۔ ”تم اس معاملے میں سنجیدہ کیوں نہیں ہوتے ہو۔“

”شاید اس لئے کہ تم مجھے میرے باس کے روپ میں بالکل اچھے نہیں لگو گے۔“ خاور نے

پانی کا گلاس اٹھا کر کہا۔

”میں تمہارا باس بنوں گا ہی نہیں۔ ہم دوستانہ ماحول میں کام کریں گے۔“ عاشر نے کہا۔

”تب اور بھی مشکل ہوگی۔ میں تمہیں سیریس نہیں لوں گا اور کام نہ ہونے کے برابر

ہوگا۔ یا کیا ہم اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کر سکتے۔ کبھی تم نے اس عورت کے بارے میں

سوچا جو پیاز کاٹی ہے اور اس کی آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔“ خاور نے بات گھمائی۔

”میں اس کے بارے میں کیوں سوچوں؟؟“ عاشر نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

”تاکہ ہم کسی اور موضوع پر بھی بات کر سکیں اس لئے۔“ خاور نے کہا اور مسکرایا۔

عاشر کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے میں

آئندہ اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔ لیکن ایک کھلی آفر تمہارے لئے چھوڑ رہا ہوں۔ میری

کمپنی کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے ہیں ایک اچھی سیلری کے ساتھ۔“

”تھینک یو..... تھینک یو دیری مچ۔“ پہلی بار خاور نے کہا۔



رات کے ڈھائی بج گئے تھے جب عاشر اپنے گھر پہنچا تھا۔ تب تک فیاض احمد گہری نیند

سوچکا تھا۔ سونے سے پہلے بھی وہ اس کوشش میں رہا تھا کہ وہ عاشر کو فون کال کر سکے۔ جب وہ

اس سلسلے میں ہاتھ روم جانے لگا تھا تو نگہت بیگم نے اس کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھ کر متحیر

ہو کر پوچھا تھا۔ ”کوئی ایمر جنسی کال آنے والی ہے۔؟“

”نہیں تو۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”پھر اپنے ساتھ فون کیوں لے جا رہے ہو۔“ نگہت بیگم نے اس کے ہاتھ میں پکڑے

موبائل فون کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ.... بے خیالی میں ساتھ ہی چل پڑا۔“ فیاض احمد چونکا اور موبائل فون تو تپائی پر رکھا

ہی خود بھی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”تمہیں جانا نہیں ہے۔؟؟“ چند ثنائے فیاض احمد کی طرف دیکھ کر نگہت بیگم نے پوچھا۔

”کہاں۔؟“ فیاض احمد نے چونک کر پوچھا۔

”ٹوائلٹ۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”وہاں کیا ہے۔؟؟“ اُس نے پوچھا۔

”تم جارہے تھے اور موبائل فون رکھ کر تم خود بھی بیٹھ گئے ہو۔“ نگہت بیگم بولی۔

”ہاں... ہاں میں جارہا تھا۔“ فیاض احمد نے کہا اور اٹھ کر ٹوائٹلٹ میں چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی واپس نکل آیا۔ جونہی وہ باہر نکلا تھا اُس نے موبائل فون اٹھایا اور کمرے سے باہر جانے کے لیے چل پڑا تھا۔

”اب تم کہاں جارہے ہو۔؟“ نگہت بیگم ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی، شیشے سے اس نے فیاض احمد کو جاتے ہوئے دیکھا تو پھر پوچھا۔

فیاض احمد رک گیا اور بولا۔ ”میں کچھ دیر ذرا باہر چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں۔“

”پہلے تو تم نے کبھی اس وقت باہر نکل کر چہل قدمی نہیں کی تھی۔“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”آج سے شروع کر رہا ہوں۔“ فیاض احمد مسکرایا۔

نگہت بیگم نے گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے دو بج گئے تھے۔ ”کچھ گھنٹوں کے بعد

دن نکلنے والا ہے اس وقت کی عادت بناؤ تو زیادہ اچھا ہے۔“

فیاض احمد نے نگہت بیگم کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا کر اپنے بیڈ پر جا کر لیٹ گیا۔ موبائل کو اس نے اپنے ہاتھ میں ہی پکڑ رکھا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ نگہت بیگم کے سوتے ہی باہر نکل کر عاشر کو فون کر دے گا۔ لیکن ایسی مہلت ہی نہیں ملی اور نگہت بیگم سے بھی پہلے وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگا تھا۔

جب عاشر آیا تو وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے، دروازہ اندر سے قفل کیا اور موبائل بند کر کے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

فیاض احمد نے صبح اُٹھتے ہی عاشر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کا موبائل بند تھا۔ اپنی کوشش کو جاری رکھتے ہوئے وہ اپنے آفس کے لیے نکل گیا تھا۔ ادیس اور کاشان بھی چلے گئے تھے۔ جب عاشر تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلا تو اس وقت نگہت بیگم ڈاننگ ٹیبل پر براجمان ناشتہ کر رہی تھی۔

”گڈ مارنگ امی جان۔“ عاشر نے ڈاننگ ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”یہ تم مجھے امی جان کیوں کہنے لگے ہو؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ میری امی جان نہیں ہیں۔؟“ عاشر نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ تم مجھے ماما کہتے تھے۔ سب مجھے ماما کہتے ہیں۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ امی جان کہنے میں زیادہ اپنائیت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ماما ہم نے کہیں

سے اُدھار لفظ لیا ہوا ہے۔ اُدھار کو سر پر نہیں چڑھانا چاہیے۔“ عاشر نے وضاحت کی اور سلاکس

پر مکھن لگانے لگا۔ اُس نے جب بھی خاور کو اپنی ماں سے مخاطب ہوتے دیکھا تھا تو وہ امی جان ہی

کہتا تھا۔ ایسا کہنا اُسے اچھا لگتا تھا۔ اس لئے وہ بھی ماما کہنے کی بجائے اسی لفظ کو استعمال

کرنے لگا تھا۔

”یہ تمہیں کس نے بتایا ہے کہ یہ لفظ اُدھار کا ہے؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف مشکوک

نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ مجھے آمد ہوئی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”آمد تو شاعروں کو ہوتی ہے۔“ نگہت بیگم کی نگاہیں بدستور اس پر تھیں۔

”آمد ہر اس شخص کو ہوتی ہے جس کی کھوپڑی میں دماغ ہوتا ہے۔“ عاشر نے کپ میں

چائے ڈالی۔

نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر جائزہ لیا اور بولی۔ ”آج تمہارے نئے آفس کا

افتتاح ہے؟“

”ہاں... آپ آرہی ہیں کیا۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”نہیں۔“ نگہت بیگم نے نفی میں گردن ہلائی اور ناشتہ کرنے لگی۔

”کیوں... کہیں اور جارہی ہیں آپ۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”تم باپ بیٹوں کے بزنس میں میرا کوئی کام نہیں ہے۔ اور میں وہاں اپنی موجودگی

ضروری نہیں سمجھتی۔ لیکن تم شام کو اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی سیدھے گھر آؤ گے۔“ نگہت

بیگم نے تحکمانہ انداز میں کہا۔



دھڑکن

عاشر نے نگہت بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ پیغام آپ کی طرف سے میں نے ڈیڈ کو دینا ہے۔؟“

”یہ تمہارے لئے ہے۔“ نگہت بیگم نے وضاحت کی۔ ”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”ابھی کر لیجئے۔“ عاشر نے کہا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔

”بات شام کو ہوگی۔ شام کو سب جلدی گھر آ رہے ہیں۔“ نگہت بیگم اپنا ناشتہ کر چکی تھی اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”خیریت تو ہے امی جان۔؟“ عاشر نے متحیر ہو کر پوچھا۔

”یہ کیا تم امی جان امی جان کہنے لگے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں اپنے بیٹے کے سامنے نہیں کھڑی ہوں۔“ نگہت بیگم کو غصہ آنے لگا تھا۔

”کبھی کبھی ماما کے بیچ امی جان کا تڑکا لگتا رہے گا۔ پھر آپ کو جب عادت ہو جائے گی تو آپ کو اچھا لگنے لگے گا۔“ عاشر آہستہ سے مسکرایا۔ نگہت بیگم وہاں سے جانے کے لیے چل پڑی

لیکن کچھ ہی قدم چل کر وہ واپس آئی اور اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آج کل تم کس کے ساتھ زیادہ ملتے جلتے ہو؟“

عاشر یکدم کچھ گھبرا سا گیا اور اپنا گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”کس کے ساتھ مطلب؟“

”میرے پاپا کہتے ہیں شیر تب ہی گھاس کھانا شروع کرتا ہے جب اس کی دوستی گھاس کھانے والے کے ساتھ ہو جائے۔“ نگہت بیگم نے اس کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ کچھ

توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ ”انہوں نے ایک بات اور بھی کہی ہے۔ جب یہ پتہ چل جائے کہ شیر نے گھاس کھانا شروع کر دی ہے تو اس کے پاؤں میں اتنی لمبی زنجیر ڈال دی جائے کہ اس کی رسائی گھاس تک تو درکنار اسے وہ دکھائی بھی نہ دینے لگے۔“ نگہت بیگم نے اس کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے اپنے سپاٹ چہرے اور متانت کی چھاؤں میں کہا۔

کچھ دیر عاشر کی طرف دیکھا اور وارننگ کے انداز میں پھر بولی۔ ”فلک کئیر۔“ نگہت

دھڑکن

بیگم نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ عاشر اپنی ماں کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کی نگاہ دیوار سے اس پار دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ جہاں تک کسی دوسرے کی سوچ دیر سے جاتی تھی، نگہت بیگم وہاں تک پہلے ہی پہنچ جاتی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ آئندہ ایسی باتوں میں احتیاط کرے گا ورنہ نگہت بیگم اس کی باتوں کی لکیروں کو کھینچ کر خاور کے دروازے تک جا پہنچے گی۔

☆.....☆.....☆

فیاض احمد اپنے کام میں کچھ ایسا مصروف ہوا کہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی عاشر کو فون کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ جیسے ہی وہ اس سے رابطہ کرنا چاہتا، پھر کوئی نہ کوئی کام آ جاتا، کوئی پارٹی آ جاتی، کسی میٹنگ کا وقت ہو جاتا، اور اسی مصروفیت میں وہ وقت بھی آ گیا جب عاشر کے نئے آفس کا افتتاح ہونے والا تھا۔

مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ شہر کی بڑی بڑی شخصیات کو اولیس اور کاشان کے ساتھ ان کا متحرک عملہ خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ عاشر بھی ہر مہمان سے مل رہا تھا۔ فیاض احمد کے قدم عاشر کی طرف بڑھتے تھے لیکن بیچ میں ہی کوئی نہ کوئی آ جاتا تھا۔ اب صرف عاشر کے نانا جمال خان کا انتظار تھا۔ جس نے عاشر کے نئے آفس کا افتتاح کرنا تھا۔ ایک بار آخر کار فیاض احمد کوشش کر کے عاشر تک پہنچ ہی گیا۔

”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ فیاض احمد نے اس کا بازو پکڑا اور ایک طرف لے جانے لگا۔

”ضروری بات مجھ سے اولیس بھائی نے کر لی ہے۔“ عاشر نے بتایا۔

”کر لی ہے۔؟؟“ فیاض احمد نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں... مجھے بتا دیا ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”کیا بتایا ہے۔؟“ فیاض احمد نے پوچھا۔

”یہ ہی کہ افتتاح کے بعد مجھے بزنس کے کچھ لوگوں سے ایک چھوٹی سی ملاقات کرنی

”میں تم سے اور بات کرنا چاہتا ہوں۔“ فیاض احمد نے جلدی سے کہا۔

”وہ اور بات کیا ہے۔؟؟“ عاشر نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ.....“ فیاض احمد کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ اور ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ جمال خان صاحب آ گئے ہیں۔ فیاض احمد کے لیے نہ تو وہاں رکنا ممکن رہا تھا اور نہ ہی بات کرنا۔ اس لئے وہ طوعاً کرہاً عاشر کے ساتھ وہاں سے چل پڑا۔ جمال خان کا سب نے استقبال کیا۔ افتتاح ہوا چائے اور کھانے پینے کا بھی اہتمام تھا اور پھر عاشر نے کچھ لوگوں کے ساتھ ایک رکی سی مختصر ملاقات کی اس کے بعد مہمان جانا شروع ہوئے تو جمال خان کو رخصت کر کے فیاض احمد ایک بار پھر عاشر سے ملنا چاہتا تھا کہ جمال خان نے کہا۔ ”مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے فیاض.... ایسا کرو کہ تم میرے ساتھ چلو... گاڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔“

”یہیں بات کر لیتے ہیں۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ بات ضروری ہے۔ آ جاؤ میری گاڑی میں۔“ جمال خان نے کہا اور فیاض احمد کو لے کر ساتھ ہی چل پڑا۔ فیاض احمد باوجود کوشش کے عاشر کے ساتھ بات نہیں کر سکا۔

☆.....☆.....☆

رات کو سب ہی نگہت بیگم کے ارد گرد جمع تھے۔ فیاض احمد نگہت بیگم کے ساتھ صوفے پر براجمان تھا۔ اولیس احمد کا شان احمد منابل اور سینہ بھی براجمان تھے۔ عاشر اکیلا ان کے سامنے یوں بیٹھا تھا جیسے اس پر کوئی مقدمہ ہو۔

”عاشر..... تئے آفس کی خوشی کے ساتھ میں تمہیں ایک اور خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔“ نگہت بیگم نے بات کا آغاز کیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”وہ کیا خوش خبری ہے۔؟“ عاشر نے مسکرا کر نگہت بیگم کی طرف دیکھا۔

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہاری شادی کر دی جائے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ فیاض احمد بھی ہولے سے مسکرایا تھا۔ ”میں نے تمہارے لئے لڑکی پسند کر لی ہے۔“

”آپ نے فیصلہ کیا ہے اور لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”ہاں۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”لیکن۔۔۔۔۔“ عاشر نے بولتے بولتے فیاض احمد کی طرف دیکھا۔

”لیکن۔۔۔۔۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”لیکن یہ کہ اپنی زندگی کا فیصلہ مجھے ہی کرنا چاہیے۔“ عاشر نے رک رک کر اپنا جملہ مکمل کر دیا۔

نگہت بیگم کو اس کی بات سن کر جہاں غصہ آ گیا وہاں سب کے چہروں پر بھی سنجیدگی دوڑ گئی تھی۔ فیاض احمد چپ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ”گھر کے فیصلے کرنے کا مجھے اختیار ہے۔ کسی اور کو نہیں۔“ نگہت بیگم کا لہجہ کسی ملک کی طرح کا ہو گیا تھا۔ گردن تن گئی تھی۔ زبان میں تمکنت تھی۔

”ہاں میں نے کب ایسا کہا ہے۔ میں نے تو یہ کہنا چاہا تھا کہ ابھی....“ عاشر نے بات سمیٹنے کی کوشش کی۔ ”ویسے ممدوہ کون خوش قسمت ہے جو آپ نے میرے لئے پسند کی ہے۔؟“

”تمہارے ماموں کی بیٹی صبا عظیم۔“ نگہت بیگم نے بتایا۔ اور ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑی۔

”صبا۔۔۔۔۔ عظیم؟؟؟“ عاشر کے منہ سے حیرانی کے ساتھ نکلا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دو تین بار بند کیا اور کھولا اور پھر کہا۔ ”ٹھیک ہے میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔“

”مجھے سوچ کر بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ نگہت بیگم کا لہجہ بدستور ویسا ہی تھا۔

”ٹھیک ہے میں ڈیڈ کو بتا دوں گا۔“ عاشر نے کہا۔

”ڈیڈ کو کیوں۔؟؟“ نگہت بیگم کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اور چہرہ درشت تھا۔

”آپ نے ہی تو کہا ہے کہ مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”ڈیڈ کو بھی بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ نگہت بیگم نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

”ٹھیک ہے میں سوچ کر چپ رہوں گا۔“ عاشر نے کہا۔ ”کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“

”عاشر تم جانتے ہو کہ مجھے اپنے کئے ہوئے فیصلے پر کسی کا انکار پسند نہیں ہے۔ میں نے

فیصلہ کیا ہے۔ ہفتہ دس دنوں میں صبا کے پاسنگاپور سے آرہے ہیں۔ تمہاری باقاعدہ بات ہوگی

اور ان ہی دنوں میں تمہاری صبا سے منگنی ہو جائے گی۔“ نگہت بیگم کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ آنکھوں

میں غصہ اور ماتھے پر دو موٹی سلوٹیں تھیں۔ کسی کی جرأت نہیں تھی کہ کوئی بچہ میں بولتا۔ عاشر نے

نگہت بیگم کی بات پوری سنی اور چپ رہا۔ ”میں تمہارے منہ سے کوئی انکار نہ سنوں۔ میری

تیسری بہو صبا ہی اس گھر میں آئے گی۔ صرف صبا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“

”صبا اچھی لڑکی ہے۔ عاشر کے ساتھ جوڑی اچھی رہے گی۔“ مناہل نے زبان کھولی۔

”ویسے کتنی اچھی رہے گی ہماری جوڑی... بھابی۔؟“ عاشر نے اس کی طرف دیکھ کر

پوچھا۔

”بہت کیوٹ۔“ مناہل نے کہا۔

عاشر نے یکدم فیاض احمد کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”ڈیڈ آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے

میرے ساتھ کوئی بزنس کے متعلق بہت ہی ضروری بات کرنی ہے۔ تو پھر چلیں میرے کمرے

میں۔“

”ہاں آؤ میں نے کچھ تمہیں بزنس کے بارے میں بتانا ہے۔“ فیاض احمد نے اٹھنے کے

لیے پر توالے۔

”بزنس کی بات یہاں بھی ہو سکتی ہے۔ تمہارے دو اور بزنس مین بیٹے بھی بیٹھے

ہیں۔“ نگہت بیگم نے کہا۔ ”یہ بھی مستفید ہو جائیں گے۔“

”ہاں...“ فیاض احمد نے بے بسی سے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا

کرے۔ اس لئے مجبوراً اس نے کہا۔ ”بیٹا بزنس کرنے کے لیے حساب کتاب ضرور آنا

چاہئے۔ اس سے بزنس پر گرفت رہتی ہے۔ بس یہی ایک نہری اصول ہے بزنس کا۔“

”لیکن ڈیڈ آپ حساب کتاب میں کمزور ہیں۔ اگر آپ کی ایک کھاتے پر گرفت ہے

تو... دوسرے کھاتے میں بہت گڑ بڑ ہیں۔“ عاشر نے بڑی ہوشیاری سے بات کہہ دی تھی جو

صرف فیاض احمد ہی سمجھ سکا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے جب عاشر کے کمرے میں فیاض احمد موجود

تھا۔ اُس نے بات وہی سے شروع کی تھی۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا کہ ایک کھاتے میں بہت گڑ بڑ

ہے۔ سارا قصور میری عادت ہے کا جسے میں آج تک نہیں بدل سکا۔ جب میرے ماں باپ

کوئی فیصلہ کرتے تھے اور مجھ سے رائے لیتے تھے تو میں ہاں ٹھیک ہے میں گردن ہلا دیتا

تھا۔ بچپن کی عادت ہے۔ میں تمہاری ماں کے سامنے بھی نہیں بول سکتا۔“

”آپ جیسی عادت آپ کے کسی بھائی میں نہیں ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”ہاں نہیں ہے۔ لیکن کچھ عادتیں جو ہماری زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہیں بعض اوقات ہم

انہیں سمجھ نہیں پاتے کہ وہ ہمارے ساتھ کیوں جڑی ہوئی ہیں۔“ فیاض احمد نے مسکرا کر

کہا۔ ”خیر یہ بتاؤ اب تم کیا کہتے ہو۔؟“

”مجھے صبا ہی نہیں اس کی ساری فیملی پسند نہیں ہے۔ سب کی گردنیں یوں اکڑی رہتی ہیں

جیسے ان میں سر یا ہو۔ بات بات میں فرعونیت جھلکتی ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر صبا سے شادی

نہیں کروں گا۔“ عاشر نے سنجیدگی کہا۔

”میری رائے تم سے بالکل ملتی ہے ان لوگوں کے بارے میں۔ لیکن تمہاری ممانکار نہیں

سنے گی۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”بھانجی ہے ناں وہ ممانکی۔“ عاشر نے کہا۔

”اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”وہ کیا ہے۔؟“ عاشر نے فیاض احمد کی طرف دیکھا۔

”صبا کے چچا زاد کی بہن کا رشتہ کچھ دن پہلے تمہارے لئے آیا تھا۔ اس کے ماں باپ نے

ہم دونوں سے ایک تقریب میں بات کی تھی۔ صبا کو پتہ چلا تو اس نے ضد سے اپنی ممان سے بات



کی اور پھر تمہارے ماموں نے تمہاری ماما سے صبا کے بارے میں بات کی۔ دراصل یہ صبا کی ضد ہے کہ جس لڑکے پر اس کے چچا زاد کی بہن کی نگاہ تھی وہ اس کی جگہ خود آنا چاہتی ہے تم سے شادی کر کے۔“ کچھ دیر توقف کے بعد فیاض احمد نے مزید کہا۔ ”وہ لڑکی دراصل تمہیں پسند کرتی ہے۔ اور تم سے شادی کرنے کی خواہش اس نے خود اپنے ماں باپ سے کی تھی۔ اس بات کا صبا کو علم تھا۔“

”لیکن میں نے کبھی اس لڑکی کی طرف غور سے نہیں دیکھا۔“ عاشر کے وہ انکشاف حیران کن تھا۔

”وہ تو تمہیں غور سے دیکھتی رہی ہے ناں۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”یہ صبا کی ضد ہے۔“ عاشر نے دانت پیسے۔ ”ضد اور گھمنڈ اس خاندان کی پہچان ہے۔ دوسروں کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی کوشش کرنا اس خاندان کی پہچان ہے۔ وہ یقیناً اسے تنگ کرنا چاہتی ہوگی، کوئی اس سے رقابت ہوگی۔“

”اور تمہاری ماما پوری طرح سے اپنی بھانجی کا ساتھ دے رہی ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔ ”یہ بات ہم سب اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ تمہاری ماما کو اپنے والدین اور بھائی بہنیں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ مجھ سے بھی زیادہ... اپنی اولاد کی خوشیوں سے بھی زیادہ۔“

”اب میں کیا کروں ڈیڈ۔؟“ عاشر سوچتے ہوئے بولا۔ ”میں کسی بھی قیمت پر صبا سے شادی نہیں کروں گا۔“

”اسی ٹکراؤ کا تو مجھے ڈر ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔ ”نگہت انکار سن نہیں سکتی اور تم وہاں شادی کرنا نہیں چاہتے ہو۔“

”میں بھاگ جاؤں۔؟؟“ عاشر نے سوالیہ نگاہوں سے فیاض احمد کی طرف دیکھا۔

”کمزور ہو تو بھاگ جاؤ۔“ فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ ماما سے بات کریں۔ آپ کا بھی ہم پر پورا حق ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”ہاں حق ہے، لیکن یہ بات تم سب پر واضح ہے کہ میں نے نگہت کو اپنے بچوں کی شادی جہاں وہ چاہے کرنے کا اختیار دیا ہوا ہے۔ اور اپنے وعدے کے مطابق میں اس کے کام میں

نہیں بول سکتا ہوں۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”لیکن یہاں آپ کو اپنا عہد توڑنا ہوگا۔ یہ آپ کے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے۔“ عاشر نے کہا۔

فیاض احمد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”میں تم ماں بیٹے کے بیچ میں نہیں بولوں گا۔ اس کے باوجود کہ میری بھی صبا کے بارے میں وہی رائے ہے جو تمہاری ہے۔“

عاشر نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔“

”ہاں لیکن کچھ اچھے انداز میں۔“ فیاض احمد نے کہا۔

☆.....☆.....☆

عاشر دوسری صبح ناشتہ کئے بغیر ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا سامنا اس کی ماما سے ہو۔ نگہت بیگم کو ڈائینگ ٹیبل پر پتہ چلا تھا کہ عاشر اپنے آفس میں چلا گیا ہے۔ عاشر نے اپنے آفس جاتے ہی سب سے پہلے خاور کو فون کیا۔ خاور نے لنچ بریک پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ عاشر کو اچانک صبا کی چچا زاد لڑکی جس کا نام فضیلہ تھا یاد آ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کب فضیلہ نے اُس کے بارے میں خود ہی فیصلہ کر لیا اور اُس نے اس کا اظہار کرنے میں بھی وقت ضائع کرنے کی پالیسی کو اپناتے نہیں رکھا۔

فضیلہ ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ عاشر نے اُسے کئی بار دیکھا تھا، لیکن کبھی بھی اس کے بارے میں اس کے دل میں ایسے جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے کہ جس سے وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ یہ بات ضرور تھی کہ وہ صبا سے بہت اچھی تھی۔ اس کے اندر کوئی گھمنڈ اور تکبر نہیں تھا۔ آج پہلی بار اس نے فضیلہ کے بارے میں سوچا تھا۔ پھر یکدم اس کی آنکھوں کے سامنے صبا کا چہرہ آ گیا تھا۔ وہی اکڑی ہوئی گردن، پھیلی ہوئی آنکھیں، ایسا لہجہ جس میں ایک روکھا پن عیاں تھا۔ عاشر نے یکدم اپنا سر جھٹکا اور صبا کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیا۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا، ابھی وقت تھا۔ لاچار اُس نے ایک فائل اٹھالی۔

خاور اپنی سیکنڈ ہنڈ کار میں سیدھا عاشر کے دفتر میں پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی انگلی میں کار کی

”تم کس لڑکی کو پسند کرتے ہو۔؟“ خاور نے کہا۔  
 ”میں کسی لڑکی کو پسند نہیں کرتا۔“  
 ”کیوں۔؟؟“

”کوئی ایسی لڑکی ملی ہی نہیں جس کو دیکھتے ہی میرے دل کے تار ہل جائیں۔“  
 خاور نے یکدم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور متحیر انداز میں بولا۔ ”تمہارے دل کو تار  
 لگے ہوئے ہیں۔ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔؟؟“  
 ”بی سیریس یار۔۔۔ مجھے کچھ بتاؤ میں کیا کروں۔“  
 ”اس صورت حال میں اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ تم نے مجھے اپنی ماما کے بارے بھی بتایا  
 ہے۔ گھر میں ان کا فیصلہ اور اختیار چلتا ہے۔ کیا سوچنا اور کیا کرنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ تم  
 اپنی زندگی کی کشتی حالات کی لہروں پر چھوڑ دو۔ اور دیکھو کیا کنارہ ملتا ہے۔ تمہاری زندگی میں  
 کوئی ایسی دستک ہوتی ہے کہ جس سے تم بھی چونک جاؤ اور دل دھڑک اٹھے۔“ خاور نے کہا  
 اور عاشر سوچنے لگا ”کیا خاور ٹھیک کہہ رہا ہے۔؟ میری الجھن کا یہ ہی حل ہے۔؟“



چابی یوں گھماتا ہوا جارہا تھا جیسے کوئی امپورٹڈ کار کی چابی ہو۔ خاور نے پہلے دروازے پر دستک  
 دی اور کسی آواز کا انتظار کئے بغیر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے اپنی کرسی پر عاشر بیٹھا ہوا  
 تھا۔

”کھانے میں کیا منگوا یا ہے۔؟“ اس نے آتے ہی پوچھا۔  
 ”کچھ نہیں۔“ عاشر نے جواب دیا۔

”کچھ نہیں... یہ کسی چائینیز ڈش کا نام تو نہیں لگتا۔ یہ اُس ڈش کا نام ہے جب گھر میں  
 بیوی کی طبیعت خراب ہو یا اس کا ساس کے ساتھ جھگڑا ہو گیا ہو، اور اس کامیاں آ کر پوچھے کہ  
 آج کیا پکا ہے تو بیوی کہتی ہے کچھ نہیں۔“ خاور نے کہا۔

”یار ایک مشکل کھڑی ہو گئی ہے۔“ عاشر اصل بات کی طرف آتا ہوا بولا۔  
 ”وہ کیا ہے۔؟؟“ خاور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔  
 ”ماما میری شادی کرنا چاہتی ہے۔“ عاشر نے بتایا۔

”اے مشکل نہیں کہتے۔ مشکل تب ہوتی ہے جب شادی ہو جائے۔“ خاور بولا  
 ”میری بات سنجیدگی سے سنو۔ میری ماما جہاں میری شادی کرنا چاہتی ہے وہ لڑکی مجھے  
 بالکل پسند نہیں ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ عاشر نے کہا۔  
 خاور نے کہا۔ ”ویسے تم اس سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے ہو۔؟“  
 ”میں کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عاشر نے فوراً جواب دیا۔  
 ”وہ لڑکی نہیں ہے۔؟؟“ خاور نے متحیر ہو کر اپنی آنکھیں پھیلائیں۔  
 ”میرا مطلب ہے کہ میں صبا جیسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔“ عاشر نے  
 وضاحت کی۔

”یہ صبا کون ہے۔؟“ خاور نے پوچھا۔

”وہی جس سے ماما میری شادی کرنا چاہتی ہے۔“ عاشر نے کہا۔  
 ”صبا سے تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے۔“ اس نے پھر پوچھا۔  
 ”بتایا تو ہے کہ مجھے پسند نہیں ہے۔ عجیب ضدی اور گھمنڈی لڑکی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”پتہ نہیں تمہارے خالو کو ہی پتہ ہے۔“ نسرین نے کہا۔

”خالو نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔؟“ فرح نے پوچھا۔

”نہیں... ابھی تک نہیں بتایا۔“ نسرین نے نفی میں گردن ہلائی۔

”کبھی ایسا ہوا ہے کہ خالو آپ کو کوئی بات نہ بتاتے ہوں اور آپ کوئی بات خالو سے چھپا کر رکھتی ہوں۔“ فرح نے کہا۔

”ہاں کئی بار ہوا ہے۔ لیکن میں تمہارے خالو سے کوئی بات نہ ادھر کہ اور نہ ادھر کی کرتی ہوں۔ لیکن تم کیا یہ باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔“ نسرین نے بات کو گھمانے کی کوشش کی اور بچن کی طرف بڑھی۔

”خالہ پہلے تو تم نے مجھے کبھی چائے بنا کر نہیں دی۔ آفس سے گھر آ کر میں ہی اپنی چائے خود بناتی ہوں۔“ فرح نے کہا۔

”ہاں لیکن آج میں بنادیتی ہوں۔“ نسرین نے کہا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”رہنے دیں میں چائے نہیں پیوں گی۔ خالو کہاں ہے مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ فرح اُلجھن کا شکار تھی۔

”مجھے کہاں بتا کر جاتے ہیں۔“ نسرین نے بھولے پن سے کہا۔

”یہ کہیں کہ وہ آپ سے کچھ چھپا کر نہیں جاتے۔“ فرح نے فوراً کہا۔

نسرین ہنسی۔ ”تم آج ان باتوں کے پیچھے ہی پر گئی ہو۔ تمہارا آفس کیسا جارہا ہے۔“

”وہ آفس میرا نہیں ہے۔“ فرح نے کہا۔

”میرا مطلب ہے جہاں تم کام کرتی ہو۔ وہ آفس کیسا جارہا ہے۔؟“ نسرین نے ٹیٹھے لہجے میں پھر پوچھا۔

”وہ آفس کہیں نہیں جاتا۔ ایک ہی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ کیونکہ ہمارا آفس بحری بیڑے میں نہیں ہے۔“

اس بات پر بھی نسرین ہنسی۔ وہ ہنسی میں باتوں کی راکھ بنا کر اڑا دینا چاہتی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ فرح کا موڈ آج ٹھیک نہیں ہے۔ موڈ ٹھیک نہ ہونے کی وجہ بھی اُسے معلوم تھی۔ وہ دل

.....

دستک دینے سے پہلے فرح نواز نے گردن گھما کر گلی کی کٹڑکی دکان کی طرف دیکھا جس کا شٹر بند تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی ایک ہلکی سی تہہ دکھائی دی اور اس نے دروازے پر اپنا ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ دروازہ نسرین نے کھولا تھا۔ وہ فرح کو دیکھتے ہی مسکرائی اور اپنے مخصوص ص بیٹھے لہجے میں بولی۔ ”آگئی تم فرح۔“

”اسلام علیکم۔“ فرح نے کہا اور اندر چلی گئی۔ نسرین نے دروازہ بند کر دیا۔

فرح نے پہلے اپنے کمرے میں جا کر ہاتھ منہ دھویا اور تولیہ سے خشک کرنے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ ”خالو کہاں ہیں۔؟“

”وہ باہر گئے ہیں کسی کام سے۔“ نسرین نے بتایا۔

”آج کیا تاریخ ہے۔؟“ فرح نے پوچھا۔

”آج۔۔۔۔۔“ نسرین یاد کرنے لگی اور پھر آنکھیں گھما کر بولی۔ ”تم تاریخ کیوں پوچھ

رہی ہو۔ آج کوئی خاص بات ہے۔“

”خالو نے کہا تھا کہ آج انہیں دکان کا قبضہ مل جائے گا۔ لیکن وہ دکان تو بند ہے۔“ فرح نے اپنی خالہ کی طرف دیکھا۔ اور ناگواری سے بولی۔

”ہاں... تمہارے خالو گئے تھے اس دکان کا قبضہ لینے کیلئے۔“ نسرین نے کہا۔

”پھر کیا ہوا۔؟“ فرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔



آپ دکان کا بندوبست کریں گے میں رقم لے لوں گی۔“ فرح نے کہا۔

”اس سے کیا ہوگا۔“ اس نے پوچھا۔

”اس سے یہ ہوگا کہ ہمیں قسط ان پیسوں سے نہیں دینی پڑے گی۔ پیسے بھی سارے محفوظ

رہیں گے۔“ فرح نے بتایا۔

”پیسے محفوظ ہی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”فرح تم خواہنا پاگل ہو رہی ہو۔ تمہارے خالو کوشش کر رہے ہیں۔“ خالہ بھی بیچ میں

بولی۔

”آپ تو کہہ رہی تھیں کہ مجھے تمہارے خالو کی کسی بات کا علم نہیں ہوتا ہے۔؟“ فرح نے

اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔“ خالہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

فرح نے اپنے خالو کے پاس جا کر کہا۔ ”خالو مجھے ڈر ہے کہ وہ رقم کہیں ضائع نہ

ہو جائے۔ جب مجھے باس نے دو لاکھ روپے دیئے تھے تو انہوں نے ایک تحریر پر میرے دستخط

بھی لئے تھے۔ وہ جتنا اچھا دکھائی دیتا ہے وہ اندر سے اتنا ہی برا ہے۔“

”فرح تم میری بیٹی ہو۔ ہم نے تمہارے ذریعے سے دو لاکھ روپے لئے ہیں۔ لیکن

واپس کرنے کی ذمہ داری ہماری ہے۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔“ شرف الدین نے پیار سے کہا۔

”خالو میں ڈر جاتی ہوں۔“ فرح بے بسی سے بولی۔

”ہم ہیں ناں۔ جاؤ تم آرام کرو ایک آدھ دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اگر دکان

نہ ملے تو میں تمہیں دو لاکھ روپے واپس کر دوں گا۔“ شرف الدین نے اُسے یقین دلایا اور فرح

مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ اور بول نہ سکی اور لاچار اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

فرح نواز ایک خوبصورت پرکشش اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس کا باپ ایک جگہ ملازمت

کرتا تھا۔ چار سال قبل جب فرح کی ماں اور اس کا باپ اس کی دادی اماں سے مل کر ٹرین سے

واپس آ رہے تھے تو اس ٹرین کو بم دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔ جہاں اور جانی نقصان ہوا تھا

وہاں فرح کے ماں باپ بھی اُسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ فرح ان کی اکلوتی اولاد تھی۔

ہی دل میں بولی تھی کہ تمہارے خالو سے کہا بھی تھا کہ مجھے بھی کچھ بتا دو اگر تمہاری غیر موجودگی

میں مجھ سے فرح نے دکان کے بارے میں پوچھا تو کیا جواب دوں۔ اس کی بات سن کر اُس

نے کہہ دیا تھا کہ وہ خود ہی بات کا جواب دے دے گا۔ فرح اپنے کمرے میں جانے ہی والی تھی

کہ اچانک دروازہ کھلا اور فرح کا خالو شرف الدین آ گیا۔ اس کی نگاہ جیسے ہی فرح پر پڑی پہلے

وہ چونکا اور اس کے بعد ہولے سے مسکرایا۔

”فرح آج جلدی آگئی ہو کیا۔؟“

”میں روز اسی وقت آتی ہوں۔ خالو آپ نے آج صبح دکان کا قبضہ لینا تھا۔؟“ فرح

نے توقف کئے بغیر کہا۔

”ہاں بات نہیں بنی۔ کرایہ اور ایڈوانس زیادہ مانگ رہا ہے۔ میں نے منع کر دیا۔“ خالو

نے کہا اور چار پائی پر بیٹھ گیا۔

”دو ماہ ہو گئے ہیں خالو اس بات کو۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ آپ نکلر والی وہ دکان لے کر

کریا نے کی دکان بنانا چاہتے ہیں۔ آپ کے مجبور کرنے پر میں نے اپنی کمپنی کے باس سے دو

لاکھ روپیہ اپنے نام سے قرض لیا۔ پیسہ قسطوں میں واپس کرنے کی بھی آپ نے بات کی

تھی۔ دو ماہ گزر گئے ہیں۔ آج سے پانچ دن کے بعد پہلی قسط دینے کا وعدہ ہے۔ آپ نے

ابھی تک کام شروع کیا نہیں ہے۔ قسط کا وعدہ آ رہا ہے۔ آپ مجھے دو لاکھ روپے واپس

آرویں۔“ فرح نے تیز لہجے میں کہا۔

شرف الدین مسکرایا اور بولا۔ ”فرح بیٹی ابھی قسط دینے میں دن ہیں۔ تم فکر نہیں کرو

۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ مجھے دو لاکھ روپے واپس کر دیں تاکہ میں وہ پیسے لوٹا دوں۔“ فرح نے تقاضا

کیا۔ ”جس مقصد کے۔ لیے پیسے لئے تھے وہ تو حل نہیں ہوا۔“

”میں نے ایک اور دکان دیکھی ہے۔ آج کل میں بات بن جائے گی۔“ خالو کے

چہرے پر کوئی الجھن نہیں تھی۔

”آپ ایک کام کریں۔ آپ مجھے وہ رقم دے دیں۔ میں واپس کر دیتی ہوں۔ جیسے ہی

گاؤں میں اس کی دادی اماں رہتی تھی وہاں ان کی زمین بھی تھی، لیکن پھر بھی فرح کا باپ گاؤں چھوڑ کر شہر میں کرائے کا مکان لے کر رہتا تھا اور ایک جگہ ملازمت کرتا تھا۔ وہ گاؤں نا جانے کے برابر ہی جاتا تھا۔ وہ ایک بھلا مانس اور انتہائی شریف آدمی تھا۔ دونوں میاں بیوی فرح کو تو اپنے اس گاؤں سے دور ہی رکھتے تھے۔ ان کے چہرے ہر وقت متفکر رہتے تھے۔

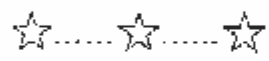
گاؤں میں کوئی بہت ہی ضروری کام تھا جس کی وجہ سے وہ گاؤں جانے کے لیے مجبور ہوئے تھے۔ وہ فرح کو اپنے ساتھ نہیں لے کر گئے تھے۔ فرح نے بھی گاؤں جانے کی ضد کی تھی لیکن اس کی ماں نے صاف منع کر دیا تھا۔ اور فرح کو خالہ نسرین کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ماں نے نسرین کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ گاؤں جا رہے ہیں۔ اور واپسی پر وہ حادثہ پیش آ گیا تھا۔

فرح کا کوئی نہیں رہا تھا۔ ایک خالہ اس شہر میں موجود تھی۔ شرف الدین اور نسرین کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے فرح کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ شرف الدین نے ساری زندگی کہیں جم کر کام نہیں کیا تھا۔ جس گھر میں وہ رہتا تھا وہ بھی اس کے باپ نے اسے دیا تھا۔ فرح نے ایک کمپنی میں نوکری کر لی تھی۔ تنخواہ کا اتنا انتظار فرح کو نہیں ہوتا تھا جتنا کہ وہ دونوں کرتے تھے۔ دونوں میاں بیوی لاچکی تھے۔ انہوں نے ایک دن فرح سے کہا تھا کہ وہ محلے میں کریا نے کی دکان کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُسے مجبور کیا کہ وہ اپنی کمپنی سے دو لاکھ روپے مانگے۔ فرح کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی سائبان نہیں تھا۔ اس کی دانست میں تھا کہ جب وہ اپنی کمپنی سے دو لاکھ روپے مانگے گی تو انکار ہو جائے اور وہ خالو کو بتا دے گی۔ لیکن اس کے برعکس اس کے پاس نے ایک تحریر پر دستخط کر اکر فرح کو دو لاکھ روپے دے دیئے تھے۔ وہ حیران تھی کہ باس اتنی فوری مان کیسے گیا۔

فرح اپنے خالو سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ تو گئی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اب خالو اور خالہ سے دو لاکھ روپے واپس لینا شاید ہی ممکن ہو۔ دونوں میاں بیوی نے اس کے ساتھ چال کھیلی ہے اور دو لاکھ روپے لے کر ہضم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کی کوئی دوست نہیں تھی، کوئی ہمارا نہیں تھی جس سے وہ اپنے دل کی بات کر سکے۔ اپنی کولیگ لڑکیوں کے ساتھ ہی اس کی دفتر کی حد تک دوستی تھی۔ لیکن ایک بات سب ہی فرح کے بارے میں

جانتے تھے کہ وہ چپ اور خاموش رہ کر اس سمندر کی طرح جو اپنے ہی کناروں سے ٹکراتا رہتا ہے سب کچھ برداشت نہیں کرتی رہتی تھی۔ یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنے خالو اور خالہ کے ساتھ لڑ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ ان کی وجہ سے ہی اسے رہنے کے لیے چھت میسر تھی۔ وہ ان سے لڑ جھگڑ کر کہاں جائے گی۔ فرح پہلی بار اتنی پریشان ہوئی تھی۔

فرح کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھی ان ہی باتوں کو سوچ رہی تھی کہ اچانک جیسے اس کے اندر کسی نے دستک دے کر کہا۔ اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ دو۔ تم نے بہتر کیا ہے تمہارے ساتھ بھی اچھا ہی ہوگا۔ اس دستک کے بعد فرح کے چہرے سے پریشانی کم ہوئی تھی۔ اُس نے اُٹھ کر کھڑکی کے آگے سے پردہ کھینچ کر ایک طرف کیا۔ سیاہ آسمان کی جھولی میں چمکتے تارے اور آدھا چاند دن کی طرف اپنی رات کی مسافت طے کر رہے تھے۔



اُٹھتا ہوا سورج اور اس کے گرد پھیلی ہوئی سُرخ کو دیکھتے ہوئے عاشق سوچ رہا تھا کہ جب اسی سورج کو عروج ملتا ہے تو کوئی اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔ آج اس کی آنکھ جلد ہی کھل گئی تھی۔ وہ اپنے بستر سے نکل کر باہر ٹیرس پر آ گیا تھا۔ صبح کی سردی بھی اُسے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی نگاہیں سورج سے ہٹا کر پوش علاقے میں ایستادہ بڑے بڑے بنگلوں پر مرکوز کر دی تھیں۔ ایسی خاموشی اور ایسا سکوت تھا کہ جیسے اس جگہ کوئی انسان نہیں رہتا۔ یہ علاقہ محض ان بڑے بڑے عالیشان بنگلوں کا ہی مسکن ہے۔ آہنی گیٹ بند تھے جیسے ان کے پیچھے بہت سی کہانیاں دفن ہوں۔ سورج کی دھوپ پھیل گئی تھی۔ پھر اچانک ایک اخبار فروش اپنی موٹر سائیکل کی آواز سے گہرے سکوت کو توڑتا ہوا آیا اس نے آہستہ رفتار میں بڑے بنگلوں کے گیٹ کے نیچے سے بڑی مہارت کے ساتھ اخبار پھینکے اور اسی طرح آگے بڑھتا گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی موٹر سائیکل کی آواز معدوم ہونے لگی اور گہرا سکوت پھر سے غالب ہونے لگا تھا۔ عاشق چند بار صبح سویرے خاور کے محلے میں گیا تھا۔ جب اُسے کرکٹ کا بیچ کھیلنا ہوتا تھا۔ اس وقت خاور کے محلے میں جاتے ہی احساس ہوتا تھا جیسے سارا محلہ رات

دھڑکن

کی چادر آسمان سے سرکتے ہی جاگ گیا ہے۔ ہر گھر سے آوازیں آتی تھیں۔ بچوں کو اسکول لے جانے کے لیے ایک کے بعد دوسرا کشتہ گلی میں آتا تھا۔ جب موٹر سائیکل کو اشارٹ کر کے کوئی اس کی ریس گھماتا تھا تو پوری گلی کو پتہ چل جاتا تھا کہ یہ کس نے موٹر سائیکل اشارٹ کی ہے۔ دودھ والے کی آواز اخبار والا بھی منہ بند کئے اخبار پھینک کر چلا نہیں جاتا تھا۔ گھر کا مکین اگر باہر نکل آتا تھا تو وہ اس کی خیریت بھی دریافت کرتا تھا۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا، دہی لاتے ہوئے جب بچے کے ہاتھ سے شاپر نیچے گر جاتا تھا تو اس کی ماں دروازے پر کھڑی دیکھتے ہی کچھ نہ کچھ غصے سے بول دیتی تھی۔ یا پھر پیار سے کہتی تھی کہ جو ہو گیا چھوڑ دو اور اب آ جاؤ۔ گلی میں رہنے والے ایک دوسرے کو اسلام علیکم بھی کہہ رہے ہوتے تھے۔ عاشر سوچ رہا تھا کہ زندگی ان بڑے بنگلوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے یا کہ ان محلوں اور گلی کوچوں میں ہے۔؟ پھر اس نے خود ہی کہا۔ اس دنیا اور اس دنیا میں بہت فرق ہے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے قریب ہیں اور یہاں بسنے والوں کے بنگلے ایک دوسرے سے نہیں ملے ہوئے۔

عاشر جب تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکل کر نیچے آیا تو وہ چونک کر رک گیا۔ ڈائیننگ ٹیبل پر سب ہی موجود ناشتہ کر رہے تھے۔ عاشر کی دانست میں تھا کہ اس وقت سب جا چکے ہونگے۔

”آ جاؤ آ جاؤ تمہاری ہی کمی تھی۔“ فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔

”آج چھٹی ہے کیا۔؟“ عاشر نے متحیر نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یہ تم نے ہم سب کو دیکھ کر پوچھا ہے۔؟“ فیاض احمد نے کہا۔

”ہاں... آپ لوگ تو اس وقت تک چلے جاتے ہو۔“ عاشر نے کہا۔

”اتفاق سے آج کسی کو بھی جلدی نہیں جانا تھا۔ کسی کی بھی میننگ بارہ بجے سے پہلے کسی کے ساتھ بھی نہیں تھی۔ اس لئے آج بہت عرصے کے بعد ایک ساتھ ناشتہ ہو رہا ہے۔“ اولیس احمد نے اس بات کا جواب دیا۔

”تو پھر مجھے بھی جلدی ہلا لیتے۔“ عاشر نے کہا۔

دھڑکن

”ہم نے کونسا ناشتہ ختم کر لیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو شروع کیا تھا۔ اب تم شامل ہو گئے ہو۔ ہم پھر سے ناشتہ شروع سے شروع کر دیتے ہیں۔“ فیاض احمد نے کہا اور سب ہی اس کی بات پر ہنس پڑے۔ ایک نگہت بیگم تھی جس کے ہونٹ جیسے سلے ہوئے تھے۔ چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ عاشر نے چورنگا ہوں سے نگہت بیگم کی طرف دیکھا اور چائے ڈالنے لگا۔

”تمہارا آفس کیسا جا رہا ہے۔؟“ اولیس نے پوچھا۔

”زبردست۔“ عاشر نے جواب دیا۔

”تم نے اپنے نئے آفس کی خوشی میں کوئی پارٹی ارنج نہیں کی عاشر۔“ منابل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج ہی ارنج ہو جاتی ہے اس میں کیا ہے۔“ عاشر نے فوراً کہا۔

”بھئی آج کا کھانا ہم عاشر سے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔“ فیاض احمد نے خوشگوار لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی نگہت بیگم کی طرف دیکھا۔ ”کیا خیال ہے۔؟“

”پرسوں تک رک جاؤ۔ عظیم بھائی سے میری بات ہو چکی ہے۔ وہ پرسوں واپس آ رہے ہیں۔ اس سے اگلے دن انہوں نے عاشر اور صبا کی منگنی کی بات کرنے کے لیے ہمیں بلایا ہے۔ عاشر کی دعوت میں صبا بھی شامل ہو جائے گی۔“ نگہت بیگم نے کہا۔ اور چائے کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے لگی۔ عاشر نے اپنا سر جھکایا ہوا تھا۔ نگہت بیگم کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے فیاض احمد کے چہرے سے مسکراہٹ معدوم ہوئی اور پھر یکدم دوبار عیاں ہوئی تو اس نے کہا۔

”پرسوں تو بہت دور ہے۔ یہ پارٹی تو آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔“

”ہاں... صبا کو آج ہی بلا لیتے ہیں۔“ سینا نے مسکرا کر اپنی تجویز پیش کر دی۔ فیاض احمد نے بدستور مسکراتے ہوئے سینا کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی یہ تجویز سن کر قطعاً مسکرا کر نہیں چاہتا تھا۔

منابل نے فوراً اس کی تائید کی۔ ”یہ خیال برا نہیں ہے۔“

عاشر کو لگا کہ وہ پھنس رہا ہے۔ کاشان بول پڑا۔ ”ویسے ماما کی بات زیادہ مناسب

”وہ بھی اب اس فیملی کا ایک حصہ ہے۔“ نگہت بیگم نے زور دے کر کہا۔

”ابھی سے؟“ عاشر نے کہا۔

”ہاں ابھی سے۔“ نگہت بیگم نے زور دینے کے انداز میں کہا۔

”لیکن آپ نے ابھی میری تو کوئی بات سنی ہی نہیں ہے۔“ عاشر نے ہمت کی۔

نگہت بیگم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”میں نے ناشتہ کر لیا ہے تم لوگ

اطمینان سے ناشتہ کرو۔“ یہ کہہ کر وہ کسی کی بھی سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ اس کی چال میں بھی

ایک عجیب سی تمکنت تھی۔

”ڈنر کہاں ہوگا؟“ سینہ نے پوچھا۔

”یہ سوال آپ مما سے کیجئے۔ کیونکہ اب صبا عظیم کی بات چلے گی۔“ عاشر نے جل کر کہا۔

☆.....☆.....☆

عاشر اپنے آفس میں بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا جب اُسے انٹرکام پر یہ اطلاع دی گئی تھی

کہ مس صبا عظیم ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ اس سے قبل کے عاشر کوئی جواب دیتا، کیسین کا دروازہ

ایک جھٹکے سے کھلا اور صبا عظیم سانپ کے پھن کی طرح گردن کھڑی کئے نمودار ہوئی اور آتے

ہی بولی۔ ”عاشر.. تم نے اپنی سیکرٹری کو بتایا نہیں تھا کہ صبا عظیم کے لیے اس کمرے میں آنے

کے لیے کسی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔؟“

”مجھے بتانا چاہیئے تھا کیا۔؟“ عاشر نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

صبا اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور پہلی بار اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور

بولی۔ ”چند دنوں کے بعد ہماری منگنی ہونے والی ہے۔ پورے خاندان کو اس بات کا پتہ ہے۔

اب بھی کیا مجھے تم تک پہنچنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت ہوگی۔؟“

”آفس میں کچھ رول ہوتے ہیں۔“ عاشر نے بتانا چاہا۔

”ہوتے ہوئے لیکن میرے لئے کوئی رول نہیں ہے۔“ صبا اس کی بات کاٹ کر

ہے۔ پرسوں کے بعد صبا کو پارٹی میں بلاتے ہیں۔“ اس کی بات سن کر عاشر کے حلق سے چائے

کا گھونٹ نیچے گیا۔ اور فیاض احمد نے جلدی سے کہا۔

”ہاں.... نگہت کی بات ٹھیک ہے۔“

”تجویز سینہ کی بھی بری نہیں ہے۔“ نگہت بیگم نے ایک بار پھر اپنی زبان کھولی۔

”ہاں.... تجویز تو سینہ کی بھی بری نہیں ہے۔“ فیاض احمد نے لاچار ڈھیلے سے انداز میں

نگہت بیگم کا بھی ساتھ دیا۔ عاشر نے اپنی گردن اٹھا کر فیاض احمد کی طرف دیکھا اور فیاض احمد

نے اپنی آنکھوں سے یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ ”یہ میری مجبوری ہے۔“

”میں فون کرتی ہوں صبا کو۔“ منابل اپنی جگہ سے اٹھی۔

”بھابی فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ پہلی بار عاشر نے کہا۔

”تم خود جا رہے ہو کہنے کیلئے۔؟“ منابل نے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں....“ عاشر نے جلدی سے یوں نفی میں گردن بلائی جیسے اسے کوئی سزا ملنے والی ہو

اور وہ انکار کر رہا ہو۔

”پھر...؟“ منابل نے پوچھا۔

عاشر نے کچھ کہنے سے قبل نگہت بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے عاشر کو دیکھ

رہی تھی۔ عاشر نے اپنی نگاہیں چرا کر کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ آج میں اپنے آفس کی

مصروفیات دیکھ لوں۔ آپ کو فون کر دوں گا۔“

”بات عاشر بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ فیاض احمد نے ہولے سے کہا۔

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ پارٹی آج ہی اریج ہو جائے گی۔“ نگہت بیگم نے اس کی

طرف دیکھا۔

”وہ میرے منہ سے نکل گیا تھا۔“ عاشر نے کہا۔

”تم ہم سب کو آج ہی ڈنر دو گے اور صبا کو میں فون کروں گی۔“ نگہت بیگم کے لہجے میں

تحکم تھا۔

”ہماری ہی فیملی ٹھیک ہے ناں ممما۔“ عاشر نے ڈرتے ہوئے کہا۔



ہولی۔ وہ آنکھیں گھماتی ہوئی آفس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”خیر اس پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔“ عاشر نے بات سمیٹ دینا چاہی۔

”ہم اس پر پھر کبھی بات نہیں کریں گے۔“ صبا نے ایک بار پھر جھٹ سے کہا۔

”ٹھیک ہے نہیں کریں گے۔“ عاشر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”ویسے کیسے آنا

ہوا۔؟؟“

”کیوں میں نہیں آ سکتی۔؟“

”میرا مطلب ہے کہ کام تھا تو مجھے بلا لیتی۔ تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔“ عاشر نے

کہا۔ اور مسکرایا۔

”ادھر سے گزر رہی تھی۔ سوچا تمہارا آفس ہی دیکھتی جاؤں۔“ صبا نے عاشر کے کمرے

میں اپنی نگاہیں گھمائیں۔

”کیسا لگا میرا آفس۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

صبا نے ایک بار پھر جائزہ لیا اور پھر منہ بنا کر بولی۔ ”بس ٹھیک ہی ہے۔“

”اس پورے پورشن میں ہم نے لاکھوں روپیہ لگا دیا ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ بس ٹھیک ہی

ہے۔“ عاشر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے میرے پپا کا آفس دیکھا ہے کیا۔؟ جو بھی دیکھتا ہے وہ دنگ رہ جاتا ہے۔“ صبا

نے ایک بار پھر اپنی گردن کھڑی کی۔

”میوزیم جیسا ماحول دیا ہوا ہے انہوں نے کیا۔؟؟“ عاشر نے پوچھا۔

”کیا مطلب۔؟؟“ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ میوزیم کو دیکھ کر ہی ہم دنگ رہ جاتے ہیں جب ہم اس میں حیران

کن چیزیں دیکھتے ہیں۔“ عاشر نے وضاحت کی۔

”میرے پپا کے آفس میں تمہیں جرمن اسپین اور لندن سے خریدے ہوئے ڈیکوریشن

پیسز ایسے ایسے دیکھنے کو ملیں گے کہ تمہاری آنکھیں ہی نہیں منہ بھی کھلا کا کھلا رہ جائے گا۔“ صبا کو

غصہ آ گیا تھا۔ ”تمہارے آفس میں مجھے کوئی یہاں کی بھی خاص چیز دکھائی نہیں دی۔“

”میں بہت جلد ورلڈ ٹور پر نکلنے کی کوشش کروں گا تا کہ بہت سی سجاوٹ کی چیزیں اکٹھی

کر سکوں۔ پھر دیکھنا میرا یہ آفس کتنا خوبصورت نظر آئے گا۔“ عاشر نے مسکرا کر کہا۔

”آج تم ڈنر دے رہے ہو۔“ اچانک صبا نے پوچھا۔

”کسے۔؟؟“ اس نے متحیر لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم سب کو۔“ صبا نے کہا۔

”ہم سب سے مطلب۔۔۔ پورے آفس کے اسٹاف کو۔؟؟“ عاشر نے اس کی طرف

سوالیہ نگاہوں دیکھا۔

”میں فیملی کی بات کر رہی ہوں۔“ صبا نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔ میں اپنی فیملی کو ڈنر دے رہا ہوں۔“ عاشر نے کہا۔

”ڈنر کہاں دے رہے ہو۔؟“ صبا نے پوچھا۔

”کبھی تم نے اس شہر کے فٹ پاتھ کے کھانے ٹیمپٹ کئے ہیں۔“ عاشر نے پوچھا۔

”تم ہم سب کو لے کر کسی فٹ پاتھ پر بیٹھنا چاہتے ہو۔“ صبا نے یکدم اس کی طرف

آنکھیں نکال کر دیکھا۔

”ہم سب سے مراد کیا۔۔۔۔ تم بھی۔۔۔؟“ عاشر نے اس کی طرف دیکھا۔

صبا نے اپنے سر کو جھٹکا اور کہا۔ ”پتہ نہیں تم کیا بولتے رہتے ہو۔ خیر میں تم سب کو لے کر

چلوں گی۔ اس ریسٹورنٹ میں تم پہلے کبھی نہیں گئے ہو گے۔“ یکدم عاشر یوں چونکا جیسے اس

کے جسم کے کسی حصے میں کوئی تکلیف اٹھی ہو۔ صبا نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ”کیا ہوا۔؟“

”میں نے تو ایک بہت ہی ضروری کام سے جانا تھا۔ میں تو لیٹ ہو گیا ہوں۔“ عاشر نے

اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنا موبائل فون اٹھا لیا۔ ”ایم سوری صبا میری ایک میٹنگ ہے۔ تم بیٹھو میں

تمہارے لئے کافی بکھواتا ہوں۔ پی کر جانا بہت اچھی کافی ہوتی ہے ہمارے یہاں کی۔“

”میں بھی جا رہی ہوں۔ مجھے ایک جگہ اور جانا ہے۔“ صبا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”انہوں نے بھی کیا میری طرح اپنے آفس میں جرمن اسپین اور لندن سے ڈیکوریشن

پیسز نہیں رکھے ہوئے۔؟“ عاشر نے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے اپنے مزاق کا نشانہ بنا رہے ہو۔؟“ صبا نے اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا تم سمجھ رہی ہو میرا مطلب تھا کہ تم انہیں مشورہ دینے جا رہی ہو۔“ عاشر نے دروازے کی طرف بڑھ کر اس کی طرف دیکھا۔

صبا نے عاشر کی طرف کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔ دونوں آفس سے باہر چلے گئے۔ لفٹ میں بیٹھے اور گراؤنڈ فلور میں جیسے ہی پہنچے دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ صبا کو لفٹ سے باہر نکلتے ہی بشیر جیلانی مل گیا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک باوقار چال چلتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے بہترین سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ صبا نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا وہ خوشگوار حیرت سے تقریباً چیخ ہی پڑی تھی۔

”انکل۔۔۔ جیلانی۔۔۔ آپ۔۔۔؟“

صبا کی آواز سنتے ہی بشیر جیلانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا چہرہ بھی کھل گیا۔ ”ارے صبا تم۔۔۔؟“

”مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ آپ یہاں میرے سامنے اتنے سالوں کے بعد کھڑے ہیں۔“ صبا کے چہرے پر حیرت بدستور عیاں تھی۔

”مجھے چند دن ہی ہوئے ہیں اس شہر واپس آئے۔“ بشیر جیلانی نے بتایا۔ اسے صبا سے مل کر بہت خوشی ہو رہی تھی۔

”اتنے سال غائب رہنے کے بعد آپ نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ کوئی اپنا اتنا پتہ نہیں چھوڑا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے آپ لوگوں کی کتنی تلاش کی تھی۔ پاپا نے الگ آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔“ صبا نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔ وہ پر جوش تھی۔

بشیر جیلانی نے صبا کا بازو پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا۔ دونوں ایک بڑے ستون کے ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔ بشیر جیلانی نے بتایا۔ ”یہ بات تم لوگوں کے علم میں تھی کہ آفتاب کو کاروبار میں اتنا نقصان ہو گیا تھا کہ سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ برباد ہو چکا تھا۔ یہاں

ختم ہوا تو وہ اپنی فیملی کو اپنے آبائی شہر میں لے گیا۔ زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی۔ پھر ایک وسیلہ بنا اور آفتاب سڈنی چلا گیا۔ اُس نے پیسہ کمانے میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اُس نے ایک ہی چیز یاد رکھی تھی کہ پھر سے اس شہر میں آ کر وقار سے اپنا بزنس شروع کرنا ہے۔ جو مقام کھو گیا تھا اُسے پھر سے پانا ہے۔ اس لئے اس نے کسی سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اب جیسے ہی حالات ٹھیک ہوئے پیسہ اُس کے ہاتھ میں آیا اُس نے مجھ سے رابطہ کیا اور پھر سے بزنس کرنے کے لیے مجھے کچھ ہدایات دیں۔ میں بھی یہ شہر چھوڑ کر کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ وہاں نوکری کر لی تھی۔ آفتاب کا حکم ملتے ہی میں نوکری چھوڑ کر فوراً اس شہر آ گیا ہوں۔ آفتاب کا باپ میرا اچھا دوست اور باس بھی تھا۔“

”آفتاب نے انکل ہم سے بھی ذکر نہیں کیا ہم اُس کی مدد کر سکتے تھے۔“ صبا نے کہا۔

”تم جانتی ہو بیٹی کہ آفتاب کس قدر خود دار ہے۔“ بشیر جیلانی نے کہا۔

”انکل۔۔۔ آفتاب بھی آگیا ہے کیا۔؟۔۔ اور وہ کہاں ہے۔“ صبا نے پوچھا۔

”آفتاب ابھی سڈنی میں ہے۔ پندرہ بیس دنوں کے بعد وہ آ رہا ہے۔“ بشیر جیلانی نے

بتایا۔

”کیسا ہے وہ۔؟؟“ صبا نے پوچھا۔ اس کی نگاہیں بشیر جیلانی کے چہرے پر مرکوز تھیں

اور وہ جاننے کے لئے یکدم مضطرب سی ہو گئی تھی۔

”پندرہ بیس دنوں کے بعد تم خود دیکھ لینا۔“ بشیر جیلانی نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آفتاب نے شادی کر لی کیا۔؟؟“ یہ سوال کر کے جیسے صبا آنکھیں جھپکنا بھول گئی ہو۔

بشیر جیلانی مسکرایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”یہ میں نہیں جانتا۔ میں

نے اس بارے میں پوچھا نہیں اور آفتاب نے مجھے بتایا نہیں ہے۔“

”آپ کو پتہ ہوگا۔“ وہ مضطرب ہو کر بولی۔ وہ بشیر جیلانی کی طرف شک بھری نگاہوں

سے دیکھ رہی تھی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں ہرگز نہ چھپاتا۔“ بشیر جیلانی نے کہا۔

”آپ مجھے آفتاب کا فون نمبر دے دیں۔“ صبا جلدی سے بولی۔

دھڑکن

”ایم سوری بیٹی میں تمہیں آفتاب کا نمبر نہیں دے سکتا۔ اُس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں کسی کو بھی اس کا رابطہ نمبر نہ دوں۔“ بشیر جیلانی نے نرمی سے کہا۔ ”میں نے ایک وقت آفتاب کے باپ کے ساتھ بھی ملازمت میں گزارا ہے۔ اب آفتاب بھلے مجھے چچا جی کہتا ہے، لیکن میں اس کا بھی ملازم ہی ہوں۔ اس لئے آفتاب کی اجازت کے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا ہوں۔“

”انکل نمبر میں آپ سے مانگ رہی ہوں۔“ صبا نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

”آفتاب نے کسی کو بھی اپنا فون اور رابطہ دینے سے مجھے منع کیا ہے۔ پلیز میری اور آفتاب کی مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ پندرہ بیس دنوں کے بعد آ رہا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ تم مجھے اپنا نمبر دے دو۔ میں اُسے دے دوں گا۔ اور تمہارے بارے میں بھی بتا دوں گا۔“ اس بار بھی بشیر جیلانی نے بڑی نرمی سے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ صبا کے تن بدن میں جیسے تیش بھر گئی ہو۔ اپنی بات کے رد ہونے کا غصہ اُسے اتنا تھا کہ اگر اس کے سامنے بشیر جیلانی نہ کھڑا ہوتا تو شاید وہ اس کی بات نہ ماننے کی پاداش میں اس کی زبان کھینچ کر باہر نکال دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ بشیر جیلانی کی یہ مجبوری ہے کہ وہ کوئی بھی کام آفتاب کی اجازت کے بغیر نہیں کرتا جہاں سے اُس نے منع کر دیا پھر چاہئے سامنے اس کا سگا بیٹا ہی کیوں نہ کھڑا ہو وہ اس کی بات بھی مان نہیں سکتا تھا۔ صبا نے اپنا رابطہ نمبر دے دیا۔ بشیر جیلانی نے ایک کارڈ نکال کر صبا کو دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری سابقہ کمپنی کا کارڈ ہے لیکن اس پر میرا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ تمہارے بارے میں میں آج ہی آفتاب کو مطلع کر دوں گا۔ اور تم سے میں رابطہ کروں گا۔“

”او کے انکل..... میں انتظار کروں گی۔“ صبا نے کہا۔ وہ آفتاب کا نمبر لینے کے لیے پھر سے بشیر جیلانی کو مجبور کرنا چاہتی تھی لیکن اس بار اس نے ایسی بات کرنے کا ارادہ بدل دیا۔ اور بشیر جیلانی کے اس انکار اور نمک حلائی کی قیمت دینے کا فیصلہ آنے والے وقت پر اُدھار چھوڑ دیا تھا۔ بشیر جیلانی کچھ دیر بعد اجازت لے کر چلا گیا۔ صبا وہاں کھڑی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ جہاں آفتاب کے لیے اضطراب دکھائی دے رہا تھا وہاں اس کا رابطہ نمبر نہ ملنے پر جیسے خون کے ساتھ انگار بھاگنے لگے ہوں۔

دھڑکن

صبا بھی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی اسی ستون کے پیچھے سے عاشر حیرت کی تصویر بنا ہر نکلنا وہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملتے دیکھ کر ہی رک گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ آفتاب کون ہے جس کے لیے صبا اتنی بے چین دکھائی دینے لگی تھی۔؟ صبا کا آفتاب کے ساتھ کیا تعلق ہے۔؟ اس سے قبل اس نے کبھی بھی آفتاب کا نام صبا کے ساتھ جڑا نہیں سنا تھا۔ عاشر کے ذہن میں سوالات کا انبار جمع ہو رہا تھا لیکن جواب کہیں سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

عاشر کی سوچ جیسے سمندر کے کناروں سے ٹکرا کر لہریں واپس آ جاتی ہیں کی طرح اس کے دماغ میں ہی گھومتی رہی تو اس نے خاور کو بلا لیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ خاور اس وقت اپنے آفس سے واپس گھر جانے کی تیاری میں تھا۔ شہر میں ایک بہترین کافی ہاؤس تھا۔ جہاں کی کافی خاص شہرت رکھتی تھی۔ عاشر نے خاور کو اسی جگہ بلایا تھا۔

کافی آنے سے قبل بشیر جیلانی اور صبا کے مابین ہونے والی ساری گفتگو عاشر نے خاور کے گوش گزار کر دی تھی۔ خاور اس کی بات غور سے سنتا رہا۔ جونہی عاشر چپ ہوا خاور نے پوچھا۔ ”میں نے ساری بات سن لی ہے اب بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔؟“

”یہ آفتاب کون ہے۔؟“ عاشر نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”سڈنی کا سفر کتنا ہے۔؟“ خاور نے پوچھا۔

”تم کیوں پوچھ رہے ہو۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”میں جا کر آفتاب کو تلاش کروں اور اُس سے پوچھوں کہ تم کون ہو۔؟ تمہارا صبا عظیم کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ وہ تمہارے لئے اتنی پر جوش کیوں ہے۔ اور وغیرہ وغیرہ۔“ خاور نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اس بارے میں جتنا سوچتا ہوں میں

اتنا ہی الجھ جاتا ہوں۔“ عاشر نے کہا۔ ”کہتے ہیں ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔“

”کسی ریاضی میں کمزور طالب علم نے کہا ہوگا۔ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔“ خاور نے

”یہ ایک محاورہ ہے۔“ عاشر نے کہا۔ ”جو آدمی اکیلا کام نہیں کر سکتا وہ مل کر گیارہ کی طرح کر جاتے ہیں۔ جب سے میں نے یہ سنا ہے میں خود بے چین ہو گیا ہوں کہ یہ جلد از جلد جانوں تاکہ جو پھندا میری طرف آ رہا ہے وہ رک جائے اور میں آزادی سے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی ماما کو وہ خوشخبری سنا سکوں۔“

”یہ تم پتہ کرو۔ تم ہی پتہ کر سکتے ہو۔“ خاور نے کہا۔

”میں کیسے پتہ کروں۔؟“

خاور نے کہا۔ ”صاحب کہاں آتے جاتے ہیں۔ اس کا پتہ کرنا ہو تو اس کی بیوی سے نہیں پوچھا جاتا“ صاحب کے ڈرائیور کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے۔ کیا سمجھے۔؟“

”لیکن صبا تو خود کارڈ رائیو کرتی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”کسی نے سچ کہا ہے کہ برنس مین کو دو اور دو کتنے ہوتے ہیں اس کا تو پتہ ہوتا لیکن وہ اس سے لاعلم ہوتا ہے کہ آملیٹ کیسے بنتا ہے۔“ خاور نے مکہ لہراتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں آملیٹ بہت اچھا بنا لیتا ہوں۔“ عاشر نے مسکرا کر کہا۔

”تم نے کبھی مجھے کھلایا تو نہیں ہے۔“ خاور نے جیسے شکوہ کیا۔

”تم کبھی میرے گھر ہی نہیں آئے۔“ عاشر نے کہا۔

”ابھی چلیں۔؟؟“ خاور اٹھنے کے انداز میں بولا۔

”ابھی۔؟؟“ عاشر نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ہمارا گھر ہماری ماما کی ایک

ریاست ہے۔ وہاں اُن کا حکم چلتا ہے۔ آنے جانے کا ویزہ بھی وہ ہی لگاتی ہیں۔“

خاور نے کہا۔ ”اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ دیکھو ڈرائیور سے میری مراد ڈرائیور ہی نہیں ہے۔ اپنے خاندان میں دیکھو کوئی تو ہوگا جو صبا عظیم کارازداں ہوگا۔ جس سے باتوں باتوں میں

یہ پوچھا جاسکے کہ یہ آفتاب کون ہے۔“

عاشر سوچنے لگا۔ ”دیکھا یہاں تک میری سوچ نہیں گئی تھی۔ کون ہو سکتا ہے جو صبا کی بہت اچھی دوست بھی ہو اور سہیلی بھی جو اس کی رازداں بھی ہو کون ہو سکتا ہے۔“ عاشر بولتے

ہوئے یوں دہرا رہا تھا جیسے وہ سبق یاد کر رہا ہو۔ ”اب اس کا کیسے پتہ چلے گا کیونکہ میں نے تو کبھی صبا کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔“

”یہ ہی تو خرابی ہے کہ تم کسی لڑکی کی طرف عارضی طور پر بھی دھیان نہیں مارتے ہو۔“ خاور نے کہا۔ ”اب اس بارے میں تم سوچ لینا۔ میں چلتا ہوں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو۔؟“ عاشر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جنگل کی طرف نکلنے والا ہوں۔ وہاں ایک گھنا درخت ہے اُس کے پہلے فلور پر میرا گھونسلا ہے۔“ خاور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صبح سے نکلا ہوں۔ اب اپنے گھر ہی جاؤں گا ناں۔“

عاشر بھی اپنی جگہ سے اٹھا ایک انگڑائی لی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے آج اپنی فیملی کے ساتھ ڈنر پر بھی جانا ہے۔ اور صبا بھی انوائیٹ ہے۔“

”صبا بھی آ رہی ہے۔؟؟“

”ہاں لیکن تم اتنے حیران ہو کر کیوں پوچھ رہے ہو۔؟“ عاشر نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے پوچھا۔

”تم باتوں باتوں اس سے پوچھنا کہ تمہاری پسند اور نہ پسند کیا ہے۔ پھر اس کی اچھی فرینڈ کے بارے میں پوچھ لینا۔“ خاور نے کہا۔

”یہ باتیں میں سب کے سامنے پوچھوں کیا۔؟“ عاشر نے کہا۔

”جب کھانا کھا لو تو کچھ دیر کے لیے صبا کو کسی بہانے سے ایک طرف الگ لے جانا۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔“

”میں بات ٹھیک ہی کرتا ہوں۔“ خاور اپنی قمیض کا کالر چھو کر بولا۔



ڈنر کے لیے سب ہی تیار تھے۔ نگہت بیگم نے صبا کو خود ڈنر کے لیے فون کیا تھا۔ صبا نے کہا تھا کہ وہ جس ریسٹورنٹ میں جائیں گے وہاں پہنچ کر مجھے فون کر دینا میں آ جاؤں گی۔ سب



دھڑکن

تیار ہو کر اپنی کار میں بیٹھ رہے تھے کہ صبا کا فون نگہت بیگم کے فون پر آ گیا۔ نگہت بیگم کیوں کہ ابھی دروازے سے نکل رہی تھی اس لئے کوئی بھی یہ نہیں سن سکا تھا کہ کس کا فون ہے۔ فون سن کر نگہت بیگم کا منہ لٹک سا گیا تھا۔ جب نگہت بیگم نے بات کر لی تو فیاض احمد نے پوچھا۔

”کس کا فون تھا۔؟“

”صبا کا تھا۔ وہ نہیں آ رہی۔“ نگہت بیگم نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ عاشر پاس ہی کھڑا اپنے کان ان کی طرف مرکوز کئے ہوئے تھا۔

”کیوں خیریت تو ہے۔؟“ فیاض احمد نے پوچھا۔

”وہ کہیں جا رہی ہے۔ کسی ضروری کام سے۔“ نگہت بیگم نے روکھے پن سے کہا۔ صبا کے نہ آنے کا افسوس ہوا تھا۔ صبح عاشر کو یہ مشکل تھی کہ اس کے ڈنر میں صبا آ رہی ہے اور اب یہ سن کر کہ وہ نہیں آ رہی اُسے جیسے ایک جھٹکا سے لگا تھا۔

”خیر کوئی بات نہیں صبا کو پھر کسی دن بلا لیں گے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”ویسے مما کہاں کا پروگرام بن گیا ہے صبا کا۔؟“ عاشر نے پوچھ ہی لیا۔

نگہت بیگم نے پہلے تو عاشر کی طرف دیکھا۔ پھر شاید اس نے یہ سوچا ہو کہ عاشر نے پہلی بار صبا کے بارے میں پوچھا ہے اس لئے بتا ہی دیا جائے اور وہ بولی۔ ”وہ نادیہ کی طرف جا رہی ہے۔ نزلہ صبا کو ہو یا نادیہ کو ڈاکٹر کی بجائے ایک دوسرے کی طرف بھاگتی ہیں۔“ آخری جملہ نگہت بیگم نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا تھا کیونکہ عاشر نے اپنی سماعت کی ساری قوت اس طرف مرکوز کی ہوئی تھی اس لئے وہ جملہ اس کی سماعت کے حصار سے باہر نکل نہیں سکا تھا۔

عاشر کا مقصد حل ہو گیا تھا۔ نادیہ حسین اس کی کزن تھی۔ شادی یا کوئی اور تقریب میں عاشر نے ان دونوں کو ایک ساتھ ہی دیکھا تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی اس لئے اس کے ذہن کے کسی کونے میں بھی نادیہ کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

فرح نے اپنا ہنڈ بیگ ایک طرف رکھا اور فرج سے بوتل نکال کر گلاس پانی سے بھرا

دھڑکن

اور پاس پڑی چار پائی پر ہی بیٹھ کر پینے لگی۔ دو گھنٹہ لینے کے بعد اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی پورے گھر میں خاموشی تھی۔ خالو اور خالہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ گھر کی چابی ساتھ والے گھر میں دے گئے تھے جیسے ہی فرح آئی تھی انہوں نے چابی اس کے حوالے کر دی تھی۔

فرح پانی پینے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ آج وہ ٹھیک طرح سے آفس میں کام بھی نہیں کر پائی تھی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ کل باس سے اُدھار لی ہوئی رقم کی طے شدہ واپسی کا دن تھا۔ خالو اور خالہ نہ تو دولا کھ روپے کی رقم ہی واپس کر رہے تھے اور نہ انہوں نے باس کو واپس دینے کے لیے کوئی پیسہ دیا تھا۔ وہ پریشان تھی کہ وہ کل اپنے باس کو کیا جواب دے گی۔ وہ اندر سے مضطرب تھی۔

فرح کی کمپنی کے باس کا نام منظور بیگ تھا۔ وہ چھوٹے قد کا گول مٹول شخص تھا۔ سر سے آدھا گنجا تھا۔ پھولے پھولے گال تھے اور ناک پر گول شیشوں والی عینک ہر وقت براجمان رہتی تھی۔ سب جانتے تھے کہ منظور بیگ انتہائی بیٹھے لہجے کا مالک ہے۔ لیکن وہ اندر سے اتنا ہی سخت کرخت اور مطلب پرست ہے کہ مسکراتے چہرے کے ساتھ میٹھی چھری چلانا وہ کسی ماہر قصاب کی طرح جانتا تھا۔

دروازے پر دستک ہوتے ہی فرح چونکی اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے خالہ اور خالو کھڑے تھے۔ فرح دروازے سے ہٹ گئی اور ایک بار پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آج وہ خالہ اور خالو سے حتمی بات کر دینا چاہتی تھی۔ کچھ وقت اپنے کمرے میں ٹہلنے کے بعد فرح صحن میں آ گئی۔ اس وقت خالہ باورچی خانے سے باہر نکل رہی تھی۔

”خالہ.... خالو کہاں ہیں۔؟“ فرح نے پوچھا۔

”وہ لیٹ گئے ہیں۔“ خالہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اس وقت لیٹ گئے ہیں۔؟“ فرح نے متحیر نگاہوں سے خالہ کی طرف دیکھا۔ ”مجھے

ان سے بات کرنی ہے۔“ وہ کمرے کی طرف بڑھی۔

”فرح بات صبح کر لینا۔“ خالہ جلدی سے آگے بڑھی۔

”نہیں بات ابھی ہوگی صبح میرے پاس وقت نہیں ہوتا ہے۔“ فرح نے کہا اور خالہ کی

”کون سے پیسے۔؟“ فرح کی حیرت میں دوچند اضافہ ہو گیا تھا۔ ”آپ نے مجھ سے دو لاکھ روپے لئے تھے کریا نے کی دکان بنانے کے لیے وہ پیسے۔“

”وہ نہیں ہیں۔“ خالو نے یہ جملہ کہنے میں کسی تغافل سے کام نہیں لیا۔ اس کا چہرہ درشت تھا۔ خالہ بھی اس بات کے بعد اطمینان سے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ فرح یہ سنتے ہی کانپ سی گئی تھی۔

”خالو یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟“

”دیکھو فرح... تم ہمارے گھر میں رہتی ہو۔ ہماری چھت کے نیچے عزت سے رہتی ہو۔ ہم تمہارے محافظ کی طرح ہیں۔ جتنے ماہ تمہیں یہاں رہتے ہو گئے ہیں۔ حساب کر لو اگر دو لاکھ روپے کرایہ نہیں بنتا تو تم مجھ سے وہ رقم واپس لے سکتی ہو جو تمہارے حساب سے زیادہ ہے۔ ہمارے حساب سے ہمارا اتنا ہی کرایہ بنتا ہے۔ اس میں وہ بجلی کے بل بھی شامل ہیں جو تم نے ادا نہیں کئے تھے۔ اور کچھ ادھار تمہاری ماں نے تمہاری پڑھائی کے لیے تمہاری خالہ سے بھی لیا تھا۔ اس لئے میں نے تمہارے کوئی بھی دو لاکھ روپے نہیں دیئے ہیں۔“

فرح مجسمہ حیرت بنی خالو کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”لیکن آپ نے مجھ سے دو لاکھ روپے کریا نے کی دکان کے لیے لئے تھے۔“

”ہاں ایسا ہی تھا۔ لیکن جب دکان نہ ملی تو ہم نے وہ رقم حساب کتاب میں جمع کر لی۔ یہ میرا گھر ہے۔ قانونی طور پر میں تم سے اس کا کرایہ لینے کا حق دار ہوں۔“ خالو کالب دلچہ متغیر تھا۔

”آپ نے مجھ سے دھوکہ کیا ہے۔ دھوکے سے پیسے لئے ہیں۔“ فرح نے کہا۔

”ہم نے کوئی دھوکہ نہیں کیا ہے۔ میں ایسی ہزاروں مثالیں دے سکتا ہوں کہ کس سگے نے اپنے کس سگے سے رہائش کا کرایہ لیا اور.....“

”لیکن آپ نے مجھ سے کچھ بھی طے نہیں کیا تھا۔ بیٹی بنا کر اس گھر میں لائے تھے آپ۔“ فرح نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”ہم نے تم سے بات کی تھی۔ اب تم بھول گئی ہو یا اُسے یاد نہیں کرنا چاہتی ہو تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔“ خالو نے اطمینان سے کہا۔

”فرح بیٹی چھوڑ ان باتوں کو۔“ خالہ نے پہلی بار مداخلت کی۔ ”یہ سوچ کہ اگر تو کہیں کرائے

پرواہ کئے بغیر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ سامنے شرف الدین کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ اور پورے کمرے میں فرائی مچھلی کی خوشبو آ رہی تھی۔ خالو نے جیسے ہی فرح کے اندر آنے کی بات سنی تھی فوراً تلی ہوئی مچھلی کا شاپر اٹھا کر اُسے الماری میں رکھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ہم آ رہے تھے کہ تمہاری خالہ کا دل چاہا کہ تلی ہوئی مچھلی لے کر چلتے ہیں۔ ہم تینوں بیٹھ کر کھائیں گے۔“ شرف الدین نے کھیسانے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ”آ جاؤ کھاتے ہیں۔“

”خالہ تو کہہ رہی تھی کہ آپ لیٹ گئے ہیں۔“ فرح نے کہا۔

”تم سے جان بوجھ کر کہہ رہی تھی۔ تمہیں مچھلی پسند ہے ناں اس لئے اچانک بتانا چاہتی تھی۔“ خالو نے کہا۔ اور مچھلی والا شاپر الماری میں رکھ کر پٹ بند کر دیا۔

”آج کھانے کا انتظام الماری میں کیا ہے۔؟“ فرح نے وائٹ پیس کر پوچھا۔

خالو نے بند الماری دیکھی تو پھر ہنس کر بولا۔ ”میں الماری سے رومال نکالنے کے لیے کھڑا تھا اور مچھلی اندر رکھ دی۔“ یہ کہنے کے باوجود اس نے الماری کھول کر اندر سے مچھلی کا شاپر باہر نہیں نکالا اور اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔

”خالو جی.... میں نے اپنے باس کو کل طے شدہ پیسے لوٹا دیے ہیں۔“ فرح نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ خالو نے اچھا کہا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آپ مجھے پیسے دیں۔“ فرح نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ خالو نے بدستور اس کی طرف دیکھتے ہی بولا۔

فرح کو اس کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا لیکن وہ تحمل سے بولی۔ ”کیا مطلب کا کیا

مطلب ہے۔؟ آپ مجھے پیسے دیں تاکہ میں انہیں واپس کر دوں۔“

”کون سے پیسے۔؟“ اس بار اور بھی حیرت سے خالو نے اس کی طرف دیکھا اور دلچہ ایسا تھا جیسے وہ کچھ بھی نہ جانتا ہو۔ اس کے چہرے پر اچانک تغیر آ گیا تھا۔

کے کمرے میں رہتی تو کتنا کراہ دیتی۔ اور پھر تمہیں ایسا تحفظ ملتا جو تمہیں یہاں مل رہا ہے۔“

فرح نے ایک نظر خالو کی طرف دیکھ کر پھر اپنی نگاہیں خالہ کی طرف مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ایسے سائبان میں رہتی ہوں۔۔۔ جو دراصل تنکوں کا ایک گھروندہ ہے۔ جہاں ایک تنکا دوسرے تنکے سے اس لئے جڑا ہوا ہے کیونکہ اُسے اس سے مطلب ہے۔ ہوا کا ایک جھوٹکا تب وہ تنکا اپنے ساتھ اڑا کر لے جائے گا جب دوسرے تنکے کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ کیونکہ اس سے سہارا جو چھوٹ جائے گا۔“ فرح نے کہا اور وہاں سے جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔ جب ساری بات کھل گئی تھی۔ پانی کا پانی ہو گیا تھا تب فرح نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ پتھر سے اپنا سر پھوڑتی رہے۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ کچھ بھی کہے لے چیخ لے آنسو بہا ان پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔

خالو نے اسے مخاطب کیا۔ ”فرح۔“ فرح رک گئی لیکن اس نے پلٹ کر خالو کی طرف دیکھا نہیں۔ خالو نے پوچھا۔ ”تو کیا تم ہوا کے جھونکے کے ساتھ تنکوں کے اس گھروندے سے الگ ہو رہی ہو۔؟“

فرح کے پاس اس وقت اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے کے لیے بے چین تھے لیکن وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اتنی پست ہمت نہیں تھی کہ وہ آنسو بہا کر اپنے آپ کو توڑتی رہتی۔ اس بات سے وہ کانپ ضرور گئی تھی کیونکہ یہ عندیہ تھا کہ وہ گھر چھوڑ دے۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر اس کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی خالو اور خالہ نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ خالہ نے کہا۔

”اچھا کیا آپ نے بات صاف کر دی۔ روز کی کچ کچ سے صاف بات بہتر ہے۔“

”میں نے بھی یہ ہی سوچ کر بات کی ہے۔“ خالو نے کہا اور اطمینان سے پلنگ کے ساتھ ٹیک لگالی۔ ”تا کہ روز ٹال مٹول کی بجائے بات ہی ختم کر دی جائے۔“

☆.....☆.....☆

دوسری صبح فرح تیار ہوئی اور خاموشی سے اپنے آفس کے لیے چلی گئی۔ دن بھر کام ہوتا رہا

تھا۔ آفس ٹائم ختم ہوا تو منظور بیگ نے فرح کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ فرح جب منظور بیگ کے کمرے میں گئی تو وہ اپنی کرسی پر براجمان چائے کے کپ میں چیچ گھما رہا تھا۔ ایک چائے کا کپ اس کی میز پر اور بھی پڑا ہوا تھا۔ جس کے اندر سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ منظور بیگ نے فرح کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر منظور بیگ نے اس چائے کے کپ کی طرف اشارہ کیا جو پہلے سے وہاں موجود تھا۔ فرح نے چائے کا کپ اپنی طرف آہستہ سے کھینچ لیا تھا۔ وہ ڈری ہوئی تھی۔

”کیسا رہا آج کا دن۔؟“ چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد منظور بیگ نے پوچھا۔

”کس کیلئے۔؟“ فرح نے پوچھا۔

”تمہارے لئے آج کا دن کیسا رہا۔“ منظور بیگ نے پھر سوال کیا۔

”جیسا روز ہوتا ہے سر۔“ فرح نے جواب دیا۔

”تم نے کبھی اپنا آج بدلنے کے لیے سوچا ہے۔؟“ منظور بیگ نے اچانک سوال کیا

اور چائے کا کپ اپنے ہونٹوں کو لگا لیا۔

”آج اور آنے والا کل گھڑی کی طرح نہیں ہوتے کہ ہم اپنی مرضی سے بدل

لیں۔“ فرح نے جواب دیا۔

”جس کی گرفت وقت کی سویوں پر ہو وہ آج آنے والا کل اور پرسوں کو بھی بدلنے کی

طاقت رکھتا ہے۔“ منظور بیگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وقت کی سویوں پر آپ جیسے بڑے لوگوں کی گرفت ہوتی ہے سر۔“ فرح نے نظریں

اپنے چائے کے کپ پر مرکوز کئے ہوئے کہا۔ ”ہم جیسے لوگوں کی کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیاں

رک جائیں تو وہ گھڑی کئی دن تک دراز میں پڑی رہتی ہے۔ اس کے سیل کا بجٹ بنتا ہے تو پھر

سے گھڑی چلتی ہے۔“

منظور بیگ ہنسا۔ ہنستے ہوئے اس کا پیٹ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ پھولے ہوئے گال اور بھی

پھول گئے تھے۔ ہنستے ہوئے اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے وہ کسی تکلیف

میں ہو۔ ”میں کبھی کبھی جب تمہیں اپنے ساتھ چائے پلانے کے بہانے بیٹھا لیتا ہوں تو یہ ایک

بہانہ ہوتا تمہاری ایسی باتیں سننے کا۔ تم نہیں جانتی کہ تم سارے اسٹاف سے اچھی ہو تمہاری

باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں..... میرا مطلب ہے کہ تمہاری باتیں سن کر مجھے مزہ آتا ہے۔“  
فرح چائے پیتی رہی۔ اُسے انتظار تھا کہ باس اس سے اپنی رقم کا تقاضا کرے گا اور پھر وہ کیا جواب دے گی۔ لیکن منظور بیگ نے وہ بات کرنے کی بجائے برنس کی کوئی اور ہی بات چھیڑ لی تھی۔ جیسے ہی منظور بیگ چپ ہوا، کچھ دیر کے بعد فرح نے پوچھا۔  
”سر میں جاؤں۔؟؟“

”مس فرح....“ منظور بیگ نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو گیا اور بولا۔ ”خیر کل بات ہوگی۔ تم جاؤ۔“

فرح اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آج باس نے اس کے ساتھ اپنے پیسوں کی بات کیوں نہیں کی تھی۔ شاید وہ کل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے بات کل پر چھوڑ دی ہے۔ فرح کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اُس گھر میں جائے۔ وہ پیدل ہی فٹ پاتھ پر چل پڑی تھی۔ اس کی متلاشی نگاہیں جیسے کسی ایسے راستے کی تلاش میں ہوں جس کے مل جانے سے وہ اپنی پریشانی کا حل ڈھونڈ سکے۔ پھر خود ہی اس کے قدم اپنے گھر کی طرف چل پڑے تھے۔ خالو کے گھر کے دروازے کے سامنے رک کر دستک دینے سے پہلے فرح نے کچھ سوچا، اپنی لا چاری کو کوسا اور پھر آخر کار دروازے پر دستک دے ہی دی کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

عاشر کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر نادیا کی حیرت میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت دوڑی گئی تھی۔ اس وقت نادیا اپنی بوتیک میں تھی۔ اس کی بوتیک شہر کے پوش علاقے کی کمرشل مارکیٹ میں تھی۔ نادیا کے خوبصورت کیمین کے شیشے سے خاور ڈیزائن کئے سوٹ دیکھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”تم یہاں.... واٹ اے سر پرائز۔“ نادیا نے مسکرا کر کہا۔

”حیرت ہوئی ناں۔“ عاشر نے اس کی طرف دیکھا۔

”بہت زیادہ.... تم پہلی بار میری بوتیک میں آئے ہو۔“ نادیا نے کہا۔

”در اصل بات یہ ہے کہ وہ میرا دوست ہے۔“ عاشر نے شیشے کی طرف اشارہ کیا۔ لگتا یہ تھا کہ خاور ایک سوٹ دیکھ رہا ہے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں اس سوٹ پر درج قیمت دیکھ کر پھیلی ہوئی تھیں۔ عاشر بولا۔ ”اس کی شادی ہے۔ چند دنوں کے بعد۔ یہ کوئی اپنی ہونے والی بیوی کے لیے سوٹ خریدنا چاہتا تھا۔ ہم یہاں قریب ہی تھے۔ تمہارے بوتیک پر نظر پڑی تو میں نے سوچا کہ اس کی خریداری بھی ہو جائے گی اور تمہارے ساتھ اس بہانے پہلو ہائے بھی ہو جائے گی۔“

”تم اپنے دوست کو اندر بلا لو۔ میں اسے خود ایک اچھا سوٹ دیتی ہوں۔“ نادیا نے کہا۔  
”نہیں ابھی تم اسے باہر دیکھنے دو۔ بہت چوڑی ہے۔ گھنٹوں لگا دیتا ہے۔ میں تو کبھی کبھی اس کے ساتھ باہر آ کر بور ہو جاتا ہوں۔“ عاشر نے کہا۔ ”اگر تم فری ہو تو ہم بیٹھ کر چائے پی لیتے ہیں۔“

”صرف ہم دونوں۔؟؟“ نادیا نے پوچھا۔

”تم اگر اپنے اسٹاف کو بھی پلانا چاہتی ہو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ تمہارا دوست چائے نہیں پیئے گا۔“ نادیا ہنسی۔

”تم اُسے چوز کرنے دو۔“ عاشر نے جلدی سے کہا۔

”ایز یوش۔“ نادیا بولی۔

”لیکن اگر تم فری ہو تو ورنہ جب تک وہ کچھ چوز کرے گا میں کہیں سے کوئی دھاگہ نکال

کر اپنے دانتوں میں لے کر بیٹھا رہوں گا۔“ عاشر نے کہا۔

نادیا ہنس پڑی۔ ”میں بالکل فری ہوں۔ میں چائے کا کہتی ہوں۔“

نادیا نے چائے کا کہہ دیا تھا۔ خاور پہلی بار اس بوتیک میں آیا تھا۔ وہ ہر سوٹ پر لگی قیمت کو دیکھتا اور سر ہلا کر کسی دوسرے سوٹ کی طرف چلا جاتا تھا۔ نادیا اور عاشر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ باتوں باتوں میں صبا کا ذکر ہونے لگا تھا۔ اور اچانک اندھیرے میں عاشر نے تیر چلا دیا۔

”تم تو صبا کی بہترین دوست ہو۔ اس کی ہر بات جانتی ہو۔ یہ بھی جانتی ہو کہ آج کل



اس کی بات میرے ساتھ چل رہی ہے۔ یہ میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیوں اور کیسے۔؟“  
”کیا مطلب کیوں اور کیسے....؟؟“ نادیا نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ وہ تو آفتاب....“ عاشر نے جان بوجھ کر اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔ اور تیرنشانے پر لگنے کا انتظار کرنے لگا۔

نادیا نے گہری نگاہوں سے عاشر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم جانتے ہو آفتاب کے بارے میں۔؟؟“

”تمہارے جتنا تو نہیں جان سکتا۔“ عاشر نے کہا۔

”جتنا بھی جانتے ہو.... کیسے پتہ ہے۔؟“ نادیا کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ عاشر کو لگ رہا تھا کہ اس کا تیر ٹھیک جگہ پر بیٹھا ہے۔

”بس پتہ چل ہی گیا کہ وہ سڈنی میں ہے اور جلدی لوٹ رہا ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”جب تم جانتے ہی تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔“ نادیا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے یہ جان کر متحیر ہوئی تھی۔

”تم اس کی اچھی دوست ہو زیادہ جانتی ہو۔ بتاؤ گی تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی زور نہیں ہے۔“ عاشر نے کہا۔

نادیا نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا۔ ”میں خود تم سے ملنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ آفتاب اور صبا ایک ساتھ پڑھتے تھے ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور آفتاب بزنس نقصان میں یہ شہر چھوڑ کر اچانک چلا گیا تھا۔ دونوں کا رابطہ بالکل ہی ٹوٹ گیا تھا۔ صبا نے مجھے کل بتایا تھا کہ آفتاب سڈنی میں ہے اور وہ دس پندرہ دنوں تک واپس آ رہا ہے۔ میں نے صبا سے کہا تھا۔ تمہاری اور عاشر کی شاید چند دنوں میں منگنی ہو جائے اس لئے بہتر ہے کہ تم سب کچھ عاشر کو بتا دو۔ لیکن اُس نے لاپرواہی سے کہا کہ ہم دونوں کی منگنی ہوتی ہے تو ہو جائے۔ آفتاب کے آنے پر اگر مجھے توڑنی پڑے گی تو میں انگوٹھی کیک میں سجا کر واپس کر دوں گی۔ کچھ بھی تھا یہ بات مجھے صبا کی اچھی نہیں لگی تھی۔“

”وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”صبا کو اُمید ہی نہیں یقین ہے کہ آفتاب نے ابھی شادی نہیں کی ہوگی۔ وہ آ کر اس سے ہی شادی کرے گا۔ اس کے باوجود صبا تم سے منگنی کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ منگنی کو ایک انجوائے منٹ کے طور پر لے رہی ہے۔ آفتاب کے آنے پر وہ منگنی ایسے توڑ دے گی جیسے کوئی میز سے گلاس اٹھا کر نیچے پھینک دے۔ اور اگر آفتاب نے صبا کو نہ اپنایا تو وہ منگنی قائم رہے گی۔“ کچھ دیر تک نادیا چپ ہوئی اور پھر بولی۔ ”صبا میری دوست ہے۔ اس کی عادات سے میں واقف ہوں۔ اس کی نیچر جانتی ہوں۔ لیکن مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ تمہاری عزت اس کے سامنے کانچ کی اُس چوڑی کی طرح ہے جسے جب چاہا توڑ کر اپنے بازو سے الگ کر دیا۔“

عاشر اس کی بات سنتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ یہ تمام باتیں اپنی ماں کو بتائے تو وہ ایک بھی بات کا یقین نہیں کرے گی۔ وہ صبا کی سیکنڈ چوائس تھا۔ عاشر کو چپ دیکھ کر نادیا نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو عاشر۔؟“

عاشر چونکا۔ ”سوچ رہا ہوں میری اور صبا کی منگنی منحصر کرتی ہے کہ آفتاب کی اگر کہیں شادی نہیں ہوئی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ ہی اس کا ارادہ ہے۔“ نادیا نے کہا۔

”تمہارا شکریہ نادیا۔ تم نے مجھے آگاہ کیا۔“ عاشر نے اس کی طرف مشکور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ تو مجھے تمہارا کرنا چاہئے۔ یہ بات کر کے مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی بوجھ سا اتر گیا ہے۔ لیکن میری ایک ریکویسٹ ہے۔ اس معاملے کو تم کیسے بھی ہینڈل کرو لیکن یہ نہیں پتہ چلنا چاہئے کہ میں نے یہ سب بتایا ہے۔“ نادیا نے کہا۔

”ہم ملے ہی نہیں ہیں۔ ہماری کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“ عاشر نے کہا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے ساری بات خاور کو بتانے کے بعد کہا۔

”مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ صبا اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ میری فیملی کی عزت آفتاب

کی ہاں کے آگے اتنی ہے کہ ہماری پہنائی ہوئی انگوٹھی وہ کیک میں سجا کر ہمیں لوٹا دے گی۔؟“

”یہ ہی موقع ہے۔ تم اپنی ماما سے ساری بات کہہ دو۔ انہیں بتا دو کہ کیا ہوگا یا کیا نہیں ہوگا۔“ خاور نے بلاتامل کہا۔

”مصیبت تو یہ ہے کہ ماما کسی بات کا یقین نہیں کرے گی۔ وہ اسے بھی صبا سے منگنی نہ کرنے کا ایک بہانہ سمجھیں گی۔ میرے کچھ کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ عاشر نے لاچارگی سے کہا۔ اور اپنے ہونٹ بھیچ کر ایک ہاتھ کار کے اسٹیرنگ پر دے مارا۔

”پھر اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔؟“ خاور نے پوچھا۔

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم سب اپنی ماما کے سامنے اتنے بے بس اور لاچار کیوں ہیں۔ اُن کا یہ رعب ہے یا ہم ان کے احترام میں بہت آگے چلے گئے ہیں۔“ عاشر نے کہا۔

”یہ ایک ماحول ہے۔ جو شروع سے تم سب کو دیا گیا ہے۔ جس کے تم عادی ہو چکے ہو۔“ خاور نے کہا۔ ”لیکن تم فکر نہیں کر دو میرے دوست۔ میں تمہیں مکھن سے بال کی طرح اس الجھن سے نکال لوں گا۔“

”جب کیک میں سچی ہوئی انگوٹھی میرے سامنے ہوگی۔؟“ عاشر نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ ایسی نوبت ہی نہ آئے۔“

”لیکن میں منگنی کی نوبت نہیں آنے دینا چاہتا۔“

”کشتی پانی میں بہا دو کوئی کنارہ کوئی سائبان تو ملے گا۔“

”ورنہ کشتی تو ڈوب ہی جائے گی۔“ عاشر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”تمہارا کام چپو چلانا ہے۔“

”بد قسمتی سے میرے پاس تو کوئی چپو بھی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں ہاتھوں سے کشتی دھکیلتے رہو۔ کنارہ دور نہیں ہے۔ کوئی سائبان آنکھوں

سے اوجھل ضرور ہے لیکن دسترس سے باہر نہیں ہے۔“ خاور نے کہتے ہوئے اپنی آنکھوں کے اوپر ہاتھ کا چھجا بنالیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ واقعی کوئی کنارہ یا سائبان تلاش کر رہا ہو۔



.....

فرح اپنے پلنگ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اُسے لگا جیسے دروازے کو کسی نے زور سے کھٹکھٹایا ہے۔ فرح اپنی جگہ سے اٹھی اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر ایک رخنہ سا بنا کر باہر دیکھا۔ خالو نے دروازہ کھولا تھا۔ سامنے کسی کو دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ اور اس نے آواز دھیمی

رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔“

”شیخ صاحب نے بلایا ہے۔“ آواز آئی۔

”کیوں۔؟“ خالو نے پوچھا۔

”وہ کہہ رہے ہیں اس ماہ کا منافع آ کر لے جائیں۔“ آواز پہلے جتنی ہی اونچی تھی۔

”ابے آہستہ بول.... چل میں آتا ہوں۔“ خالو نے دانت پیس کر کہا۔

”جلدی آ جانا.... ہم نے دکان بھی بند کرنی ہے۔“ وہ پھر بولا۔

”ابے تو نکل میں آتا ہوں۔“ خالو نے کہا اور دروازہ بند کر کے ایک بار اوپر فرح کے

کمرے کی طرف دیکھا۔ اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جب کچھ دیر بعد خالو باہر نکلا تو اس نے

واسکٹ پہن لی تھی۔ خالو اس کے پیچھے پیچھے سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”ذرا سنبھل کے۔ رات کا وقت ہے چور پیچھے نہ لگ جائیں۔“

”میں نوٹوں کا ٹرک بھر کر نہیں لا رہا ہوں۔ جتنے ہو گئے میری جیب میں آ جائیں

گے۔“ خالو نے پھر سے دانت پیسے۔

دھڑکن

”جلدی آ جانا۔“ خالہ نے پھرتا کید کی۔ ”اور شیخ صاحب کو ایک بار پھر سختی سے منع کر دینا کہ وہ آئندہ اپنا لڑکا گھر نہ بھیجا کرے۔ تم خود ہی اس کی دکان پر چلے جایا کرو گے۔ اسے پتہ چلے یا کل کو کسی اور کو یہ میں نہیں چاہتی ہوں۔“

”میں نے منع بھی کیا تھا کہ باہر نکل کر کوئی بات نہ کرنا۔ وہ سن لے گی۔“ خالو نے کہتے ہوئے فرح کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ فرح اب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ خالو نے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ انہوں دو لاکھ روپے اس سے کرائے کی مد میں لئے ہیں۔ اس کے باوجود فرح یہ بتانے کے لیے کہ اس نے سب سن لیا ہے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ خالہ کی نگاہ جیسے ہی فرح پر پڑی وہ ٹھٹھک گئی۔

”اب مجھ سے چھپانے کی کیا کوشش کر رہے ہو خالہ۔ وہ پیسے آپ نے مجھ سے کرائے کے حساب کتاب میں لے لئے ہیں۔ لیکن میری ماں نے آپ سے کوئی ادھار پیسہ لیا ہو اس کا مجھے یقین نہیں ہے۔“ فرح نے کہا۔

”کوئی تحریر ہوتی تو میں ضرور دکھاتی۔ پھر تجھے یقین آ جاتا۔“ خالہ نے اتر کر کہا۔

”ویسے خالہ آپ نے مجھ سے کس حساب سے کرایہ وصول کیا ہے۔؟“ فرح اس کے سامنے آ گئی تھی۔

”حساب کتاب تمہارے خال کو ہی پتہ ہے۔“ خالہ نے کہہ کر جان چھڑائی۔

”جو میں گھر کا خرچہ کرتی رہی ہوں اس کا کیا حساب ہوگا؟“ فرح نے پوچھا۔

”مجھے کیا پتہ۔“ اس نے انجان بن کرنفی میں گردن ہلائی۔

”کے پیچھے“

”تیرے خال کو۔“

فرح نے خالہ کا مکار منہ دیکھا اور کہا۔ ”کاش آپ میری خالہ بن کر مجھے اپنے پاس رکھتیں۔“

”خالہ بن کر ہی رکھا ہوا ہے۔“ یکدم خالہ چونکی۔ ”ارے ہاں رکھنے سے ایک بات یاد آئی ہے۔ کرنی تو تم سے صبح تھی لیکن کیونکہ تم اب میرے سامنے ہی ہو اس لئے اب کر دیتی

ہوں۔ لیکن نہیں صبح ہی کروں گی۔ تیرے خالو نے صبح ہی کرنے کے لیے کہا تھا۔“

”کیا بات ہے خالہ اب کرلو۔“

”تمہارے خالو نے کہا تھا میں تمہیں آفس جاتے ہوئے بتا دوں۔ صبح بتاؤں گی۔“ خالہ نے کہا اور کمرے کی طرف جانے لگی تو پھر رک گئی۔ ”اچھا بتا ہی دیتی ہوں۔ دراصل تمہارے خالو کے ایک دوست ہیں۔ وہ اپنا مکان بنانے لگے ہیں۔ اور چار پانچ ماہ کے لیے انہیں کرائے کے لیے مکان چاہئے ہے۔“ خالہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

”پھر۔؟؟“ فرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”پھر۔۔۔۔۔ مجبوری ہے۔۔۔ ہم کہنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن مجبوری ہے تم سمجھ لیتا۔۔۔ تم ہفتہ دس دنوں میں اپنا کمرہ خالی کر دینا۔“ خالو نے کہا۔

اس کی بات سن کر فرح دم بخود اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ ”کمرہ خالی کردوں۔؟؟“

”ہاں میں نے یہ ہی کہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اوپر والا پورشن تمہارے خالو نے ان کو دینے کی

حامی بھری ہے۔“

”لیکن میں کہاں جاؤں گی۔؟؟“

”اب میں کیا کہہ سکتی ہوں فرح۔“

”آپ نے مجھ سے کراپہ لیا ہے۔۔۔۔۔“

”وہ کراہے تو گئے مہینوں کا ہے۔“

”میں اور ادا کر دیا کروں گی۔“ سائبان جانے کی فکر میں فرح نے کہہ دیا۔ وہ لاچار تھی۔

”اب ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ ہم مجبور ہیں۔“ خالہ نے کہا۔

”خالہ تم جانتی ہو کہ ہمارا کوئی رشتہ دار اس شہر میں نہیں ہے۔ میں ایک اکیلی لڑکی ہوں۔ کہاں جاؤں گی کیا کروں گی۔“ فرح پریشان ہو گئی تھی۔

”تمہارے خالو کا حکم ہے تم تو جانتی ہو کہ میں تو ان کے آگے ایک لفظ بھی نہیں بولتی

ہوں۔ جو وہ کہتے ہیں وہ گائے بن کر سن لیتی ہوں۔ اور گائے کی طرح کام میں لگی رہتی ہوں۔“ خالہ نے محصومیت سے کہا۔ پھر اس نے یکدم کہا۔ ”تم گاؤں کیوں نہیں چلی

وہمتر کی

جاتی۔ وہاں تمہاری دادی ہے اور میرا خیال ہے کہ زمین بھی ہے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ فرح نے اس کی بات نظر انداز کر کے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن کچھ نہیں فرح... تجہارے خالو نے ان سے ایڈوانس پکڑ لیا ہے۔ میں تمہیں ایک ہفتہ پہلے اطلاع دے رہی ہوں تم کہیں بھی اپنا رہنے کا انتظام کر لو۔“ خالہ نے اس بار حتمی انداز میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ فرح حیرت کی تصویر بنی کھلے آسمان کی ستاروں بھری چھت کے نیچے صحن میں کھڑی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

نگہت بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کا بھائی عظیم کمال آ گیا تھا۔ اور عظیم کمال نے آتے ہی جو سب سے پہلا کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے نگہت بیگم اور فیاض احمد کو رات کے کھانے میں بلا لیا تھا۔ کھانے کے دوران ہی عاشر اور صبا کے رشتے کی بات بھی ہو گئی تھی۔ صبا بھی وہاں موجود تھی۔ وہ بھی خوش دکھائی دے رہی تھی اس نے اپنی کسی بات اور تاثر سے یہ عیاں نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اُس نے جو سوچا تھا وہ اس کے دل میں ہی تھا اور اس پر عمل کرنے کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی بوجھ یا پریشانی نہیں تھی۔ وہ پُر اعتماد تھی اور دل مطمئن تھا۔ اُسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے شطرنج کی بساط پر ایک ایسا کھلاڑی براجمان ہے جو اپنی چال چلنے کے لیے اپنے ہاتھوں کی اُنگیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کئے اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھے ہوئے ہو اور نگاہیں بساط پر بکھرے مہروں پر ہو۔ وہ اپنی محبت بھی نہیں کھونا چاہتی تھی اور عاشر کو بھی اپنی دسترس میں رکھنا چاہتی تھی۔

طے یہ پایا تھا کہ پانچ دن کے بعد صبا کی سالگرہ آرہی تھی۔ اسی دن شہر کے کسی بڑے ہوٹل میں ان کی منگنی ہوگی۔ فیاض احمد مسکراتے ہوئے ہنستے ہوئے خوشی سے ہاں میں ہاں ملا رہا تھا لیکن وہ بھی دل سے اس رشتے کے لیے خوش نہیں تھا۔

رات گئے جب نگہت بیگم اور فیاض احمد واپس آئے تو اس وقت سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ عاشر جاگ رہا تھا لیکن وہ باہر نہیں نکلا تھا۔ چنانچہ صبح ناشتے کی میز پر جو بھی آیا تھا

وہمڑ کن

اُسے پہلی خوشخبری یہ ہی دی گئی تھی کہ عاشق اور صبا کی منگنی جمعرات کی رات ہوگی اور ایک آدھ دن میں کسی ہوٹل کو اس تقریب کے لیے منتخب کر لیا جائے گا۔ اس خبر کو سن کر سب ہی خوش ہوئے تھے۔ اولیں اور کا شان نے ہوٹل کے نام بھی دیئے تھے کہ عاشق کی منگنی کی تقریب کہاں ہو۔ اس وقت یہ ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ عاشق بھی آ گیا۔

”تیار کر لو جمعرات کو تمہاری منگنی ہے۔“ منابل اُسے دیکھتے ہی بولی اس کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔

”جمعرات کو۔؟؟“ عاشق نے تحقیر ہو کر کہا۔

”ہاں جمعرات کی رات کو۔ کیونکہ اس دن صبا کی برٹھ ڈے ہے۔“ اس بار نگہت بیگم نے



”مما آپ نے خود ہی فیصلہ کر لیا ہے۔“ عاشق نے کہا۔

”پہلے بھی میں خود ہی فیصلے کرتی ہوں۔“ نگہت بیگم نے فوراً کہا۔

”لیکن پہلے کی بات اور تھی اور اب.....“ عاشر نے کہنا چاہا۔

”اب کیا ہے؟“ ٹھٹ بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھ سے آپ کو یو چھنا چاہئے تھا۔“ عاشر نے ایٹی نگا ہیں جھکا کر آہستہ سے کہا۔

”کیوں۔؟؟“ نگہت بیگم نے اپنی نگاہیں اس کی طرف چوست کر کے کہا۔

”میں کیا چاہتا ہوں۔ میری رائے لینی چاہئے تھی۔“ عاشر نے کسی چھوٹے بچے کی طرح



”تم کیا چاہتے ہو۔؟ اب میں تم سے یہ پوچھوں۔؟“ نگہت بیگم کا لہجہ درشت ہو گیا

تھا۔ ”مجھے کسی سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے یہ تم جانتے ہو۔“

”ہاں میں جانتا ہوں لیکن.....“ عاشق نے کہا اور کرسی پر اپنا پہلو بدلا۔

”لیکن یہ کہ آئندہ تم مجھ سے ایسی بات نہیں کرو گے۔“ نگہت بیگم نے ایک ایک لفظ پر

زور دے دیتے ہوئے کہا

”لیکن.....“ عاشرا تناکہ کر پھر چپ ہو گیا اور اپنے ہاتھ ملنے لگا۔



”بس... کوئی بات نہیں ہوگی۔“ نگہت بیگم نے جیسے چھوٹے بچے کو ڈانٹا ہو۔

”آپ میری لیکن کے آگے تو سنیں کہ میں آپ کو کیا بتانے والا ہوں۔“ عاشق نے چاہا کہ وہ صاف لفظوں میں سب کچھ بتادے۔

”عاشق۔۔۔ میں نے کہہ دیا ہے تو کہہ دیا ہے کہ تم مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کرو گے۔ اوکے۔“ نگہت بیگم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی شہادت کی انگلی کھڑی کر کے درشت لہجے میں کہا۔

”آپ نہیں جانتی ہیں کہ.....“ عاشق نے پھر کہنا چاہا۔

”میں کچھ جانتا نہیں چاہتی ہوں۔“ نگہت بیگم نے پھر اسی لہجے میں ٹوک دیا اور فیاض احمد کی طرف اپنا چہرہ کر کے بولی۔ ”آپ عاشق کو سمجھا دیں گے گھر میں کوئی ٹینشن کھڑی نہ ہو۔ اور اگر اس نے انکار کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔“

”میں انکار نہیں کر رہا ہوں لیکن مجھے بولنے کا موقع تو دیں۔“ عاشق نے کہا۔

”عاشق تم کیا بحث لے کر بیٹھ گئے ہو۔“ اولیس نے مداخلت کی۔

”یہ بحث نہیں ہے اولیس بھائی یہ بات ہے کہ....“ عاشق نے اس کی طرف گھوم کر کہا۔

”میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ آپ اسے سمجھا دیں کہ میرے فیصلے کے آگے اگر اس نے زبان دراز کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“ نگہت بیگم نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ یکدم وہاں پر خاموشی چھا گئی۔ سینا نے اس خاموشی کو توڑا۔

”عاشق چھوڑو۔ تم جانتے بھی ہو کہ ہوگا وہی جو ماما چاہتی ہے۔ بہت دیر بعد گھر میں خوشی آ رہی ہے۔ اس رشتے سے انکار کرو گے تو ماما ناراض ہو جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ ماما اس لئے ناراض ہو گئی ناں کہ میں انکار کروں گا۔ میں انکار کروں گا ہی نہیں۔ اب صبا کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ کوئی انکار نہیں ہوگا۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“ عاشق نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ فیاض احمد اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ نگہت بیگم نے کمرے کی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھتے ہوئے سنا اور جیسے ہی عاشق وہاں سے گیا اس کے چہرے پر تمکنت سے بھرپور ایک مسکراہٹ

عیاں ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

موقع ملتے ہی فیاض احمد عاشق کے دفتر میں جا پہنچا۔ ایک دو باتیں ادھر ادھر کی کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ”اب تم کیا کرنے والے ہو۔؟“

”اب میں لٹچ کروں گا۔“ عاشق نے بتایا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے کیا صبا کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ فیاض احمد نے پوچھا۔

”نہیں۔“ عاشق نے لٹی میں گردن ہلائی۔

”تم صبح کہہ رہے تھے کہ تم اب انکار نہیں کرو گے اور صبا کے حوالے سے کوئی بات بھی نہیں کرو گے۔“ فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں ایسا کہا تھا۔“ عاشق نے کہا۔

”کیا سوچ کر کہا تھا۔“ فیاض احمد نے جاننا چاہا۔

”کچھ بھی سوچ کر نہیں کہا تھا۔ بس ایسے ہی کہہ دیا تھا۔“ عاشق نے اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہا۔

”کچھ تو سوچ کر کہا ہوگا۔“ فیاض احمد نے پھر پوچھا۔

”بس ڈیڈ کہہ دیا۔ کوئی بھی بات ایسی ذہن میں نہیں ہے کوئی راستہ نظر میں نہیں ہے۔ جو منہ میں آیا بول دیا۔ ہاں ایک بات یہ ہے کہ ماما کو انکار سے چڑ ہے ناں۔ میں انکار نہیں کروں گا۔ میری زبان پر انکار نہیں آئے گا۔“ عاشق نے کہا۔

”اقرار آئے گا۔؟“ فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اقرار بھی نہیں آئے گا۔“ عاشق نے کہا۔

”تو تم پھر کیا کرنے والے ہو۔“ فیاض احمد نے پھر پوچھا۔

”یہ مجھے بھی نہیں پتہ۔ بس کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ عاشق نے کہا۔ اور سوچنے لگا کہ کیا ہوگا۔

دھڑکن

”کمال ہے تم نے کچھ سوچا بھی نہیں ہے اور بہت کچھ کہہ بھی دیا ہے۔ گھر میں ایک ٹکراؤ کی کیفیت ہو جائے گی۔ میں تو ریفری کے فرائض بھی انجام نہیں دے سکتا۔“ فیاض احمد نے تشویش سے کہا۔

”آپ دعا کیجئے۔“ عاشر ہولے سے بولا۔

”وہ تو میں تمہاری ماما کے حق میں کرتا رہتا ہوں۔“ فیاض احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔

”میرے حق میں بھی کیجئے۔“ عاشر نے کہا۔

فیاض احمد چپ ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”گھر کا سکون برباد نہ ہو تو ایک ہی راستہ بچتا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تم اپنی۔۔۔۔۔ ماما کی بات مان ہی لو۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ عاشر نے فوراً کہا اور فیاض احمد کو صبا اور آفتاب کے بارے میں بتانے کے لیے اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ پھر یکدم چپ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اس بات کے بتانے کا جب کوئی فائدہ ہی نہیں ہے تو ڈیڈ کو یہ سب بتا کر ان کو خواہ مخواہ پریشان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ صبا اور آفتاب کے بارے میں حقیقت متکشف ہو جانے سے فیاض احمد کوئی ایسی دیوار کھڑی کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ جس سے عاشر کو کوئی فائدہ ہو جائے گا۔ اس لئے عاشر چپ ہو گیا۔

”ممکن ہونا تو نہیں چاہئے میں نے بس وسیع تر مفاد میں بات کی تھی۔“ فیاض احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔

”فلاں کام ہم نے وسیع تر مفاد کے پیش نظر کیا ہے یہ بیان ہم لوگ تب ہی دیتے ہیں جب ہم کچھ نہیں کر سکتے یا دوسرے سے اندر ہی اندر مل جاتے ہیں۔“ عاشر نے کہا۔

”لیکن بیٹا میں کسی سے نہیں ملا ہوں۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”میں نے جنرل بات کی ہے۔“ عاشر بولا

”اچھا کیا کہ تم نے جنرل بات کی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ تمہاری ماما تمہارا صبا

دھڑکن

سے رشتہ بغیر کسی مفاد کے نہیں کر رہی ہے۔ اندر کی کوئی بات شاید ہے جس کی وجہ سے وہ اتنی بھند ہے کہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ یہ اس کی عادت ہے لیکن پھر بھی مجھے کچھ کالا کالا دکھائی دے رہا ہے۔“ فیاض احمد نے سوچتے ہوئے ایک نئی بات اپنے شک کی بنیاد پر کھول دی تھی۔

”کیا بات ہو سکتی ہے۔؟؟“ عاشر نے فیاض احمد کی طرف دیکھا۔

”مجھے معلوم نہیں ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا شک غلط ہو لیکن مجھے لگتا

ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”یہ ہو بھی سکتا ہے۔ آپ ماما سے پوچھیں۔“ عاشر نے کہا۔

فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھ کر نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ ”نہیں پوچھنا کیا ہے یہ

ایسے ہی ایک خیال آ گیا تھا۔ تم چھوڑو ان باتوں کو اور کچھ اور سوچو۔“ پھر یکدم وہ بولا۔ ”ویسے میں پتہ کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”آپ پتہ لگائیں کہ اندر کی کیا بات ہے۔ صبا کے نام کوئی بہت بڑی جائیداد تو نہیں

ہے۔؟“ عاشر نے فیاض احمد کی طرف دیکھا۔

”دولت تمہاری ماما کے پاس کیا کم ہے جو تمہارے نانا نے اُسے دی تھی۔ دولت کے

علاوہ کوئی بات ہو سکتی ہے۔“ فیاض احمد نے عاشر کا خیال مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”میں بھی کسی طرح سے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ عاشر نے کہا۔

”یہ خیال رکھنا کہ کہیں تم سیدھا اپنی ماما سے ہی نہ پوچھ لینا۔ ایک نیا ہنگامہ کھڑا

ہو جائے۔“ فیاض احمد نے تاکید کی۔

☆.....☆.....☆

”فرح... فرح...“ خالہ اور کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز ایک ساتھ فرح کی

سماعت سے ٹکرائی تو وہ جلدی سے اپنے ہنڈ بیگ کو چھوڑ کر آگے بڑھی اور دروازہ کھول

دیا۔ سامنے خالہ کے ساتھ ایک خاتون کھڑی تھی۔ خالہ مسکرا کر بولی۔ ”فرح انہیں کمرہ دیکھنا



سکے۔“ منظور بیگ نے بتایا۔

فرح نے کچھ سوچا اور پھر کہا۔ ”او کے سر۔“

”آفس ٹائم کے بعد تم جانا مت۔ ہم یہاں سے ایک ساتھ ہی جائیں گے۔“ منظور بیگ نے کہا اور فرح اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆.....☆.....☆

منظور بیگ اپنی گاڑی میں فرح کو شہر کے ایک اچھے ہوٹل میں لے گیا تھا۔ اس کا ڈرائنگ ہال اس وقت تقریباً خالی تھا۔ منظور بیگ نے فرح کو ایک میز کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود ڈوائٹ لٹ جانے کا کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ فرح کرسی پر براجمان ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد منظور بیگ آ گیا اور آتے ہی اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”کھانے کا آرڈر دیا تم نے؟“

”نوسر۔“ فرح نے گردن نفی میں ہلائی۔

”تو کیا کھاؤ گی؟“ منظور بیگ نے میز پر کارڈ پکرتے ہوئے پوچھا۔

”سرا بھی آپ کے مہمان تو آئے نہیں ہیں۔“ فرح نے کہا۔

”وہ نہیں آرہے۔ ان کی بیگم کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ ابھی ابھی مجھے فون آیا ہے۔“ منظور بیگ نے کہا۔

”تو سر پھر میں چلتی ہوں۔“ فرح نے اپنا ہنڈ بیگ سنبھالا۔

”کھانا کھا کر چلی جانا۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے۔“ منظور بیگ نے اپنی نگاہیں مینیو کارڈ کے اوپر سے اٹھا کر کہا۔

”سر میں گھر کھانا کھاؤں گی۔“ فرح بولی۔

”یہاں بہت اچھا کھانا ملتا ہے۔ تم پہلے یہاں کبھی آئی ہو۔“ اس نے کہا۔

”میں پہلے کبھی نہیں آئی سر۔“ فرح بولی۔

”تو پھر اطمینان سے کھانا کھاؤ۔“ وہ بولا۔

”ویسے بھی یہ کھانے کا ابھی وقت نہیں ہے۔“ فرح نے کہا۔

منظور بیگ نے اس کی طرف دیکھا اور مینیو کارڈ ایک طرف رکھ کر بولا ”مجھے تم سے ایک ضروری بات بھی کرنی ہے۔ میں کئی دنوں سے تم سے یہ بات کرنا چاہتا تھا۔ اس دن میں نے تم سے پوچھا بھی تھا کہ کیا کبھی تم نے نہیں چاہا کہ تم اپنا وقت بدل لو۔“ منظور بیگ نے کہا۔ ”در اصل میرے پاس سب کچھ ہے۔ دولت جائیداد بزنس گاڑیاں اور بہت کچھ۔۔۔ بیوی سے تین سال پہلے علیحدگی ہو چکی ہے۔ بچے اپنی ماں کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ ایک بڑے گھر میں اکیلا رہتا ہوں۔ اپنے نوکروں کے ساتھ۔“ فرح اس کی بات غور سے سن رہی تھی۔ منظور بیگ کچھ دیر کے لیے چپ ہوا اور پھر بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میرا گھر میری دولت میری گاڑیاں اور بینک بیلنس میں۔۔۔ تم بھی شریک کرو۔“

فرح نے متحیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتی۔“

منظور بیگ نے کہا۔ ”صاف الفاظ میں بات یہ ہے کہ تم فرح سے اگر مسز منظور بیگ بن جاؤ تو تمہاری اور میری زندگی بدل جائے گی۔“

”کیا کہا۔ کیا کہا۔ آپ نے یہ کہنے سے پہلے سوچا کہ آپ کی عمر میرے باپ کی عمر کے برابر ہے۔ آپ نے اتنی آسانی کے ساتھ یہ سب کہہ کیسے دیا۔؟ میں آپ سے شادی کروں۔“ فرح کو یکدم غصہ آ گیا۔ اس نے کسی بات کی کوئی پرواہ نہیں کی اور منظور بیگ کی جانب جھٹک کر بلند آواز میں کہنا شروع کر دیا کہ ہال میں موجود لوگ ہی نہیں ویٹرز بھی اپنا اپنا کام چھوڑ کر ان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ منظور بیگ کو اُمید نہیں تھی کہ فرح اس کی بات سن کر اس طرح سے ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔

”تم آہستہ بات کرو۔“ منظور بیگ نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے شرم آتی ہے آپ کو سر کہتے ہوئے۔ آپ اپنی جائیداد کی بات کرتے ہو میں آپ

کی نوکری پر لعنت بھیجتی ہوں۔“ فرح نے اسی اونچی آواز میں کہا۔

”تم آہستہ بات کرو۔“ منظور بیگ نے دانت پیس کر آواز دباتے ہوئے کہا۔



دھڑکن

”میں چلا کر بتاؤں گی۔ سب کو بتاؤں گی یہ بوڑھا مجھ سے یعنی کہ اپنی بیٹی کی عمر سے اپنی دولت کے بل بوتے پر شادی کرنا چاہتا ہے۔“ فرح اور بھی چلائی۔

”شٹ آپ۔“ منظور بیگ بھی چلایا۔

”یوشٹ آپ۔“ فرح نے اس سے بھی زیادہ چیخ کر کہا۔

”تم نے میری بے عزتی کی ہے۔ نکالو میرا دولا کھر روپیہ۔ ابھی اور اسی وقت ورنہ تمہاری تحریر میرے پاس موجود ہے میں تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی کروں گا اور تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑوں گا۔ نکالو میرے پیسے۔“ منظور بیگ بھی غصے سے کوئی پرواہ کئے بغیر چیخ پڑا۔ لوگوں کی نگاہیں ان دونوں پر ہی تھیں۔ پھر وہ یکدم فرح کی طرف اپنی گردن بڑھا کر آواز کو آہستہ رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے جس کاغذ پر پیسے وصول کرتے ہوئے دستخط کئے تھے وہ نامکمل تحریر تھی۔ باقی میں نے تمہارے دستخط کے بعد جو لکھنا تھا وہ لکھ لیا تھا۔ قانون کا ایسا پھندہ تمہارے گلے میں ڈالوں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گی۔“

فرح اس کی بات سن کر یکدم چپ ہو گئی تھی اور اس کا مکار چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس کاغذ پر چند سطریں لکھی ہوئی تھی کہ وہ دولا کھر روپیہ ادھار وصول کر رہی ہے اور ساتھ ادائیگی کا طریقہ لکھا تھا۔ اور باقی کاغذ خالی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے ناجانے کیا لکھ لیا ہے۔ اور اس تحریر کی وجہ سے وہ اس پر کیا قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ آج اس پر یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ منظور بیگ نے اس دن دولا کھر روپے کیوں دے دیئے تھے کیونکہ اس کے دل میں اس کے بارے میں جو کچھ تھا اس کا اظہار اس نے آج کر دیا تھا۔ پھر اچانک فرح نے اس کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو کرنا ہے کرو۔ میں نہیں ڈرتی۔“ فرح نے کہا اور جانے کے لیے خارجی دروازے کی طرف چلی گئی۔

منظور بیگ چلایا۔ ”تیار رہنا تم۔۔۔ اور دیکھنا کہ میں کیا کرتا ہوں۔“

فرح نے مڑ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ اُس نے یہ کہہ تو دیا تھا کہ وہ جو کرنا چاہتا ہے کر لے اُسے کوئی ڈر نہیں ہے۔ لیکن وہ اندر سے سچ مچ ڈر گئی تھی۔ ناجانے اس نے

دھڑکن

خالی جگہ پر کیا لکھ لیا تھا کہ وہ کچھ بھی اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتا تھا۔ منظور بیگ کی بات سن کر اسے غصہ بھی اتنا آ گیا تھا جسے برداشت کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا۔

فرح اور منظور بیگ کی جہاں اور لوگوں نے اس جگہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر باتیں سنی تھیں ان میں ایک خاور بھی تھا۔ جو اس ہوٹل میں اس لئے موجود تھا کہ دوسرے شہر سے اس کی کمپنی کا بڑا افسر یہاں آیا تھا۔ اور اس نے کسی کام سے اُسے یہاں بلایا تھا۔ خاور ان کی باتیں سن کر جہاں حیران ہوا تھا وہاں اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ بھی آ گئی تھی۔ وہ منظور بیگ کو بھی جانتا تھا۔ اور اس کے اسٹاف میں موجود لڑکی شگفتہ سے بھی اس کی ہیلو ہائے تھی۔ کیونکہ وہ کچھ عرصہ اس کی کولیگ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

فرح مضطرب تھی۔ اسے ایک پل بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک جگہ ایک منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھ رہی تھی۔ جو کچھ اس نے سنا اور اس کے جواب میں اس نے جو کچھ بھی کہا تھا اب اُسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ وہ بہت جلد جذباتی ہو گئی تھی اگر وہ مسکرا کر کچھ وقت سوچنے کے لیے مانگ کر وقت نکال لیتی تو شاید آئیو الے وقت میں وہ کوئی بہتر راستہ نکال لیتی۔ کوئی بہانہ کر لیتی اور ٹال مٹول کر لیتی۔

فرح نے اپنا موبائل فون نکالا اور اپنی کولیگ ندا کا نمبر ملانے لگی۔ کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا تھا۔ ”ندا۔۔۔ میں بول رہی ہوں فرح۔“

”ہاں مجھے تمہارے نمبر سے ہی پتہ چل گیا تھا۔ کیا بات ہے فرح۔“ ندا نے کہا۔

”آج ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ فرح نے کہا۔ وہ بدستور گھبراہٹ کا شکار تھی۔

”کیا ہو گیا ہے۔“ ندا نے پوچھا۔

اس کے جواب میں فرح نے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔ اور پھر بولی۔ ”ندا

میں بہت ڈر رہی ہوں کہ پتہ نہیں اب کیا ہوگا۔“

”ہاں نے تم کو شادی کی آفر کر دی۔؟“ ندا کی حیرت ناک آواز ابھری۔

دھڑکن

”اس پر اب حیران ہونے والی بات نہیں ہے کیونکہ میں نے اسے جو سنا نا تھا وہ سنا دیا ہے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اب جانے وہ کیا کر دے۔ اس نے تحریر کیا لکھ لی ہے۔ نیچے میرے دستخط ہیں۔“ فرح نے جلدی سے کہا۔

”باس کمینہ ہے ہم سب جانتے ہیں لیکن اتنا ہے یہ مجھے آج پتہ چلا ہے۔“ ندا کی حیرت ابھی تک اسی جگہ تھی۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔“ فرح پھر اس طرف آئی۔

”تم نے باس کے منہ پر تھپڑ کیوں نہیں مار دیا۔“

”تھپڑ مادیے سے کیا ہو جاتا۔؟“

”ہم بھی اس کے آفس میں کام کرتے ہیں کم از کم وہ ہم سے ایسی بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔“ ندا کی آواز آئی۔

”وہ تم لوگوں سے ایسی بات کرتا ہے کہ نہیں کرتا تم کو ابھی سے فکر لگ گئی ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں۔“ فرح نے کہا۔

”تم نے اسے کھری کھری سنا کر بہت اچھا کر دیا ہے۔ اب مزید کیا کرنا چاہتی ہو۔“

”ندا..... ندا..... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ دو لاکھ کے لیے مجھ پر قانونی چارہ جوئی کرنا چاہتا ہے۔ میں کیا کروں۔؟“ فرح نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ندا سوچتے ہوئے بولی۔ ”ہاں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تم کوئی وکیل کیوں نہیں کر لیتی۔“

”مجھے زندگی میں پہلی بار اس شخص نے شادی کی آفر کی ہے۔ تم کسی وکیل کو کر لینے کی بات کر رہی ہو۔“ فرح نے جلدی سے کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ تم کسی وکیل سے ملو اور اس سے مشورہ کرو۔“ ندا نے کہا۔ ”ایک

منٹ ٹھہرو۔ تم ایک پتہ نوٹ کرو۔ یہ میرے ابو کے دوست ہے۔ تمہارے گھر سے زیادہ دور نہیں رہتے ہیں تم ان کے پاس چلی جاؤ میرا بتانا اور جو پوچھنا چاہتی ہو وہ پوچھ لینا۔“

ندا نے فرح کو پتہ نوٹ کر دیا۔ فرح کے پاس اس تحریر کی کوئی دوسری کاپی نہیں تھی۔ اس نے اپنا بیگ لیا اور گھر سے باہر چلی گئی۔ رات کے ابھی ساڑھے آٹھ ہی ہوئے تھے۔ پندرہ

دھڑکن

منٹ کی پیدل مسافت کے بعد وہ ایک گھر کے سامنے کھڑی تھی جس کے دروازے کے ساتھ ایک نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر اس وکیل کا نام بمعہ ڈگریوں کے لکھا ہوا تھا۔ فرح نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ اسی وکیل نے کھولا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ وہ فرح کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔ ”فرح نواز.....؟“

”جی.....“ فرح نے حیرت سے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”ابھی ابھی مجھے ندا کا فون آیا تھا۔ اسی نے تمہارے بارے میں بتایا تھا

اندر آ جاؤ۔“ وکیل صاحب نے کہا۔ فرح اس کے ساتھ اندر چلی گئی۔ وہ کمرہ کتابوں بے

ترتیب کاغذات کے ساتھ بھرا ہوا تھا۔ کرسی پر بھی کتابیں تھیں۔ وکیل صاحب نے ایک جگہ

فرح کے لیے بیٹھنے کے لیے صاف کی اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ فرح نے رقم لینے اور

جو تحریر اس کاغذ پر لکھی ہوئی تھی اس کے بارے میں بتایا اور کاغذ پر کتنی جگہ خالی تھی وہ بھی بتا دیا

تھا۔

”اس کی کاپی ہے تمہارے پاس۔؟“ فرح کے چپ ہونے پر وہ بولا۔

”کاپی نہیں ہے۔“ فرح نے نفی میں گردن ہلائی۔

”تمہیں ایک کاپی لیننی چاہیے تھی۔ اس طرح کیا ہوگا۔ وہ کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔ کوئی ایسی

شرط کوئی ایسی بات کہ جس سے تم پھنس جاؤ کیونکہ نیچے تمہارے دستخط موجود ہیں۔“ وکیل

صاحب نے کہا۔

”آپ کچھ کیجئے سر۔ اس نے مجھ سے دھوکہ کیا ہے۔“ فرح نے پریشان ہو کر کہا۔ وہ

اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔

”اب جانے وہ کیا لکھ لے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہمارے پاس تو اس کی کوئی کاپی بھی

نہیں ہے۔ تم ایک کام کرو۔ چپ ہو جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد میں سوچ سکتا

ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”سر میں بہت خوفزدہ ہوں۔“ فرح نے کہا۔

”ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس کی دھمکی ہی ہو۔ وہ کچھ کرے

ہی نہ۔“ اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”وہ اپنی رقم نہیں چھوڑ سکتا ہے سر۔“

”ہاں وہ نہیں چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ کیا کرتا ہے اور پھر ہمیں کیا کرنا ہے۔“ وکیل صاحب کی بات نے فرح کو اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ سوچتی ہوئی وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی اور ایک طرف ہو کر چلنے لگی تھی۔ گھر خالی کرنے کا حکم اور اوپر سے ہاس کی یہ پریشانی، فرح اضطراب کا شکار ہو گئی تھی۔ پہلے چھت چھن رہی تھی اب نوکری بھی چلی گئی اور دولا کھر روپے کی آفت الگ سر پر مسلط ہو گئی جو جانے کیا رخ اختیار کر جائے۔ بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اچانک کوئی غیبی مدد اس کے پاس پہنچ جائے۔ وہ سوچوں میں محو رہی تھی کہ اس کے موبائل فون کی بیل نے اسے چونکا دیا۔ فون کی اسکرین پر شگفتہ کا نام آ رہا تھا۔

”ہاں شگفتہ۔“ فرح نے مریل سے انداز میں کہا۔

”کہاں ہو۔؟“ شگفتہ کی آواز ابھری۔

”کوئی خاص بات ہے کیا۔؟“ فرح نے مزید گھبرا کر پوچھا۔

”آج جو کچھ ہوا مجھے پتہ چل گیا ہے۔“ شگفتہ نے کہا۔

”ندانے بتایا ہے۔؟“ فرح نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے کہا۔

”باس سے پوچھا تم نے۔؟“ فرح نے متحیر ہو کر پوچھا۔

”میں اس سے کیوں پوچھوں۔ تم جہاں بھی ہو میرے فلیٹ میں آ جاؤ۔“ شگفتہ نے کہا۔

”شگفتہ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ وہ باس نا جانے کیا کر دے۔ میں کہیں بھاگ جانا

چاہتی ہوں۔ میں بہت خوفزدہ ہوں۔“ فرح نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”کہیں بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم ابھی میرے پاس آ جاؤ۔ ابھی اسی وقت

اور دیر نہیں کرنی اوکے۔“ شگفتہ نے تاکید کی۔

”اوکے۔“ فرح نے کہا اور ایک رکشے والے کو روک کر اس میں بیٹھ گئی۔ وہ جاتے

ہوئے سوچ بھی رہی تھی کہ شگفتہ کو کیسے پتہ چلا اور اس نے اچانک فون کر کے اسے اپنے پاس

کیوں بلا لیا ہے۔؟

شگفتہ کا باپ اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اس کی ماں ایک کالج میں لیکچرار تھی اور شگفتہ جاب کرتی تھی۔ دونوں ماں بیٹی اس فلیٹ میں اکیلی رہتی تھیں۔ جب فرح وہاں پہنچی تو شگفتہ نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گئی۔ شگفتہ کی ماں اس وقت کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے فرح کا اچھی طرح سے حال پوچھا اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت فرح چونک پڑی تھی جب اس کی نظر کمرے میں موجود ایک اجنبی پر پڑی تھی۔ وہ اطمینان سے ایک طرف کرسی پر براجمان تھا۔ فرح کو لگا کہ یہ اس کے خلاف سازش ہوئی ہے۔ وہ شخص یقیناً منظور بیگ کا کوئی آدمی ہے۔

”فرح ان سے ملو۔ یہ خاور ہیں۔ ہم نے کچھ عرصہ ایک ساتھ کمپنی میں کام کیا تھا۔ میری

وہ بڑی غلطی تھی جب میں نے کچھ زیادہ کی لالچ میں اس کمپنی کو چھوڑا تھا۔ خاور بہت ہی اچھے

انسان ہیں۔ میرے بھائی کی طرح ہیں۔ میں ایک بار ان کے گھر گئی تھیں۔ تم خاور کی امی کو مل لو

تو پھر کئی بار ان کے گھر جانا تمہاری بھی مجبوری بن جائے گی۔ جیسی کی میری بن گئی تھی۔“ جب

شگفتہ نے خاور کا تعارف کرایا تو فرح کی سانس بحال ہوئی تھی۔

”تعریف پھر کسی دن ہو جائے گی۔“ خاور نے شگفتہ کی طرف دیکھ کر سمجھانے کے انداز

میں کہا۔

”ہاں بات یہ ہے کہ جب تمہاری اور باس کی ٹوٹو میں میں ہو رہی تھی تو خاور بھی ان

دیکھنے اور سننے والوں میں شامل تھے۔ یہ بھی باس کو بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اور کیونکہ

ان کو علم تھا کہ میں اس آدمی کی کمپنی میں کام کرتی ہوں۔ لہذا انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور

تمہارے بارے میں پوچھا اور ہوٹل میں ہونے والی ساری بات مجھے بتادی۔“ شگفتہ نے بتایا۔

”آگے میں بتاتا ہوں۔“ خاور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”دولا کھ کا ذکر سنا تو آپ کے چہرے پر

آنے والا خوف میں محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ منظور بیگ کیا

کر سکتا ہے۔ وہ دل کا بہت برا اور زبردست شخص ہے۔“

فرح مزید خوفزدہ سی ہو کر بولی۔ ”آپ مجھے ڈرارہے ہیں۔“  
 ”نہیں میں بتا رہا ہوں۔“ خاور نے کہا۔ ”بہر حال میری بات شگفتہ سے ہوئی۔ اور میں نے بتایا کہ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“  
 ”مدد۔؟؟“ فرح نے پہلے خاور کی طرف اور بعد میں شگفتہ کی جانب متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں... دو لاکھ روپے ہم ادا کر دیں گے۔ ورنہ وہ آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا ہے۔“ خاور نے کہا۔  
 ”لیکن میں پہلے ہی دو لاکھ روپے لے کر پھنس چکی ہوں۔ میرے خالو اور خالہ نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں کمپنی سے دو لاکھ روپے لوں۔“ فرح نے کہا۔

”مجھے شگفتہ آپ کے بارے میں سب بتا چکی ہے۔ جو دو لاکھ روپے ہم آپ کو دیں گے وہ واپس نہیں لیں گے۔“ خاور نے کہا اور جیب سے ایک کارڈ نکال کر فرح کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کارڈ ہے۔ کل دس بجے اس جگہ چلی جانا۔ ظاہر ہے کہ اب آپ منظور بیگ کی نوکری تو کریں گی نہیں اس جگہ آپ کو نوکری بھی مل جائے گی اور رہائش کا بھی انتظام ہو جائے گا۔“

فرح نے کارڈ لیا اور پڑھا۔ وہ کارڈ عاشق کا تھا۔ ”یہ عاشق صاحب کون ہیں۔؟“  
 ”یہ ایک بہت ہی نفیس شریف اور اچھا نوجوان ہے۔ دولت مند ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی بھی ایسی خصلت پونچھ کی طرح نہیں لگی ہوئی جیسی کہ بڑے لوگوں کے بچوں کو لگی ہوتی ہیں۔ ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ دل کا اچھا ہے۔ اور بہت ہی اچھا ہے اور خدا ترس ہے۔ مجبور لوگوں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔“ خاور نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”فرح تم کسی خوف کے بغیر اس جگہ چلی جانا۔ میں ان کو بھی جانتی ہوں۔ ڈرنا مت۔“ شگفتہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔  
 ”لیکن شگفتہ یہ میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہیں۔؟“ فرح نے پوچھا۔

”اگر آپ کہتی ہیں تو نہیں کرتے۔ پھر آپ دیکھ لیں ایک اکیلی لڑکی اور وہ ظالم منظور بیگ۔“ خاور نے کہا۔

فرح کے لیے انکار کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ تو مجبور تھی۔ گھر کی چھت اس سے چھن رہی تھی۔ منظور بیگ کچھ بھی اس کے خلاف قدم اٹھا سکتا تھا۔ ایسے میں خاور کا ماننا اندھیرے میں روشنی کی طرح تھا۔ شگفتہ نے اس کی ہر طرح سے تسلی کر دی تھی۔ اس کے دل میں جو کوئی بھی ابہام تھا وہ بھی معدوم ہو گیا تھا۔ دو لاکھ روپے ادا ہو جائیں نوکری کے ساتھ رہائش بھی مل جائے تو اس کے لیے لاٹری سے کم نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ اس دنیا میں اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے شاید اس کی قسمت کا بندرستہ اسی طرح سے کھلنا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس پیشکش سے ضرور فائدہ اٹھائے گی۔

☆.....☆.....☆

خاور نے جو منصوبہ تیار کر کے عاشق کو بتایا تھا اُسے سن کر عاشق کا چہرہ مسکراہٹوں میں نہا گیا تھا۔ خاور نے عاشق سے کہا تھا کہ وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ فرح کے ایک طرف کھائی ہے اور دوسری طرف سمندر ہے۔ اُس کا بچنا اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی آسمان سے جہاز میں سوار ہو کر آئے اور اُسے اٹھا کر اوپر کھینچ لے۔ فرح کھائی اور سمندر میں گرنے کی بجائے اس بات کو ترجیح دے گی کہ اوپر سے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لے۔

فرح جب عاشق کے آفس میں پہنچی تو پہلے اس نے اس ہال نما آفس کا جائزہ لیا جہاں اسٹاف اپنی اپنی جگہ بیٹھا اپنے اپنے کام میں مصروف تھا۔ فرح نے اپنے بارے میں بتایا تو سیکرٹری نے عاشق کو اطلاع دے کر اندر بھیج دیا۔ عاشق اپنے کمرے میں اپنی کرسی پر براجمان تھا۔ اُس نے پہلی بار فرح کو دیکھا جو کچھ ڈری اور سہمی سی ہوئی تھی۔ عاشق نے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا اور فرح اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تو آپ ہیں فرح نواز۔؟“ عاشق نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
 ”جی سر۔“ فرح نے جواب دیا۔



”سر۔“

”بہت خوب کہ آپ میری ساری بات کو جلدی سمجھ گئی ہیں۔ اب آپ میری اس سلسلے میں مدد کریں گی۔“ عاشر نے کہا۔

”کیسی مدد سر۔؟“ اس نے متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہم دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔ ہم دونوں کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیا آپ میری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔؟“ عاشر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے کیا کرنا ہے سر۔؟“ فرح بدستور حیران تھی۔

”آپ میرے ساتھ میرے گھر میں بیس دنوں تک رہیں گی۔ میں سب کے سامنے یہ ڈرامہ کروں گا کہ..... میں نے فرح سے چند ماہ پہلے خفیہ شادی کر لی تھی۔“ عاشر نے کہہ دیا۔ فرح یکدم چونکی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟“ فرح اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”آپ میرے گھر میں بڑی عزت کے ساتھ رہیں گی۔ ہر طرح کے تحفظ کے ساتھ وہ دن گزاریں گی۔ یہ محض ایک ڈرامہ ہوگا۔ تاکہ میری منگنی صبا سے نہ ہو۔ کل کو اگر آفتاب آ جاتا ہے تو اس کے اپنانے سے میرے گھر میں ایسا ایک نہ آئے جس میں ہماری بے عزتی گئی ہوئی ہو۔ اس ڈرامے سے میں اپنی ممانعت سے یہ بھی کہہ سکوں گا کہ آپ کو میں نے انکار نہیں کیا ہے۔ ہم شادی کر چکے تھے۔ میں بتانا چاہتا تھا لیکن آپ نے نہیں سنا۔ اب میں آپ کی بہو کو اپنے گھر لے آیا ہوں۔“ عاشر فرح کا دم بخود چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

فرح بولی۔ ”میں جانا چاہتی ہوں۔“

عاشر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”صرف بیس دن کی بات ہے۔ آفتاب آئے گا۔ صبا کو اگر اپنائے گا تو ہم آزاد ہو جائیں گے۔ ہمارے خاندان میں میاں بیوی میں اختلاف ہو جانا اور پھر طلاق ہو جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں اپنی فیملی کو آپ کے بارے میں پہلے ہی سچ بتا دوں گا کہ آپ ایک غریب گھر کی ہیں۔ صبا کا معاملہ ٹل جائے گا تو اسی بات کو بنیاد بنا کر ہم الگ ہو جائیں گے۔“

”مجھے خاور نے بتایا ہے۔ جو کل ہوا اس کے بارے میں بھی اور جو آپ کی خالہ اور خالو نے آپ کے ساتھ سلوک کیا تھا اس کے بارے میں بھی۔“ عاشر نے کہا۔

”اس کے بارے میں خاور صاحب کو کیسے پتہ چلا۔؟“ فرح نے چونک کر پوچھا۔

”آپ کی کولیگ نے انہیں بتایا تھا۔ دونوں بہن بھائی کی طرح ہیں۔“ عاشر نے بتایا۔

فرح کو یاد آیا کہ اُس نے شگفتہ سے اس بارے میں ذکر کیا تھا کہ جو دولا کھ روپے خالو اور خالہ نے منگوائے تھے وہ واپس کرنے کی بجائے انہوں نے کرائے کی مد میں رکھ لئے اور اوپر سے جس کمرے میں وہ رہتی ہے اُسے بھی خالی کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

”یس سر۔“ فرح نے کہا اور اپنی فائل جس میں اس کی اسناد تھیں وہ عاشر کے آگے بڑھا دی۔ عاشر نے فائل دیکھی اور ایک طرف رکھ دی۔ ”دولا کھ روپے ہم منظور بیگ کے ادا کر دیں گے۔ آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔ اس کی فکر کرنا آپ چھوڑ دیں۔ وہ دولا کھ روپے میں آپ سے واپس نہیں لوں گا۔ یہ مسئلہ آپ کا حل ہو گیا۔“ عاشر نے کہا۔ کچھ دیر چپ ہوا اور پھر بولا۔ ”اب جو میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں آپ غور سے میری بات سنیں۔“

فرح نے اپنی توجہ عاشر کی طرف مبذول کر دی۔ پہلے عاشر نے اپنی فیملی کے بارے میں بتایا کہ اس کے گھر میں کون کون رہتا ہے۔ پھر اس نے اپنی ممانعت کے بارے میں اس کے مزاج کے بارے میں بات کی اپنے ڈیڈ کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کے ساتھ کسی دوست کی طرح رہتے ہیں اس کے بعد اس نے صبا عظیم کی فیملی کے بارے میں بتایا اُن کا غرور، گھمنڈ اور تمکنت کی بات کی اور بتایا کہ صبا کی منگنی اس کی ممانعت کے ساتھ کرنا چاہتی ہے جبکہ وہ اور اس کا ڈیڈ ایسا نہیں چاہتے ہیں۔ اور بتایا کہ صبا کا تعلق آفتاب کے ساتھ ہے اور اگر وہ شادی شدہ نہ ہو اور اس نے پھر سے صبا کو اپنا لیا تو جو اس کے گھر میں کیے آئے گا اس میں اس کی منگنی کی انگوٹھی بھی سچی ہوئی ہوگی۔

عاشر سب کچھ بتانے کے بعد جب چپ ہوا تو کچھ دیر کے بعد فرح نے پوچھا۔ ”ایم سوری سر صبا ٹھیک نہیں کر رہی ہے۔ لیکن آپ کیوں کہتا چکے ہیں کہ آپ کی ممانعت سنے کے موڈ میں نہیں ہے اس لئے بات کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے

دھڑکن

”آپ کسی ڈرامے والی لڑکی سے بات کریں۔“ فرح نے اپنی فائل اٹھائی اور جانے

کے لیے مڑی۔

”ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ دیکھو اس آفر کو ٹھکرا کر اگر تم باہر جاؤ گی تو منظور بیگ کا دو لاکھ روپے کا قرض اور چند دنوں کے بعد بے گھر ہونے کا خوف کیا کرو گی۔؟ میں تمہیں رہنے کے لیے ایک فلیٹ دس لاکھ روپے کیش اور اپنی کمپنی میں اچھی نوکری کی آفر کرتا ہوں۔ قسمت دستک دے رہی ہے دروازے کو کھولو دستک کو نظر انداز مت کرو۔ صرف پندرہ یا بیس دنوں کی بات ہے۔“

فرح جانے کے لیے گھوم تو گئی تھی لیکن اس کے قدم جیسے اسی جگہ رک گئے تھے۔ دو لاکھ روپے قرض کا بوجھ تھا۔ دو دنوں کے بعد خالو اس کا سامان گھر سے باہر پھینک دیں گے نوکری اس کے پاس نہیں رہی تھی، شگفتہ نے بھی یقین دلایا تھا کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں، خاور کو وہ اپنے بھائی جیسا کہتی تھی اُسے ایک موقع مل رہا تھا۔ بیس دنوں کے بعد اس کے پاس فلیٹ بھی ہوگا روپے بھی ہونگے وہ بے گھر ہونے سے بچ جائے گی۔ وہ لاوارث ہو کر کسی کے در پر نہیں پڑی رہے گی۔ ہاتھ میں کچھ ہوگا تو وہ مستقبل کے بارے میں بھی سوچ سکے گی۔ اور اگر وہ انکار کر کے اس آفس سے باہر چلی جاتی ہے تو پھر وہی دنیا ہوگی وہی منظور بیگ اور اس کے دو لاکھ روپے کا قرض آسمان کی چھت ہوگی نوکری کے لیے نا جانے اُسے کتنے پاڑ بیلنے پڑیں گے وہ نوکری تلاش کرے گی کہ رہنے کے لیے چھت۔؟ مسائل کا ایک انبار ہوگا۔ ان سے نجات کا راستہ اس کے سامنے تھا۔ اداکاری تو وہ کالج کے زمانے میں بھی کرتی رہی ہے۔ اسے بھی ایک رول سمجھ کر ادا کر دے گی۔ جبکہ عاشر اُسے ہر طرح کا یقین بھی دلا رہا ہے۔ زندگی میں ایک تجربہ ایسا بھی سہی۔ فرح نے سوچا اور عاشر کی طرف گھوم گئی۔

”اور اگر صبا کو آفتاب نے نہ اپنا یا تو پھر کیا ہوگا۔ وہ خطرہ تو آپ کے سر پر منڈلاتا رہے

گا۔“

”اس کے بارے میں بعد میں سوچا جائے گا۔ اور میرا نہیں خیال کہ اگر ایسا ہوا تو پھر صبا

مجھے اپنائے گی۔“ عاشر نے کہا۔

دھڑکن

”آپ کی ممانے اگر طوفان اٹھا دیا اور مجھے گھر سے نکال دیا گیا تو پھر کیا ہوگا۔“ فرح نے دوسرا سوال کیا۔

”ممانے کے ایک بھائی نے بھی ایسے ہی شادی کی تھی۔ جواب بھی کامیاب جا رہی ہے۔ میں انہیں مثال دے سکتا ہوں کہ میں نے ماموں کی پیروی کی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

فرح نے کچھ اور سوچا اور پھر بولی۔ ”میں اس گھر میں رہوں گی۔؟“

”آپ اس گھر میں رہیں گی اور بہت اچھی طرح سے رہیں گی۔“ عاشر نے جلدی سے کہا۔

فرح نے کچھ دیر بعد پھر پوچھا۔ ”کیا آپ کے اس منصوبے کے بارے میں شگفتہ کو پتہ ہے۔؟“

”اُسے خاور نے صرف اتنا بتایا تھا کہ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور نوکری دینا چاہتے ہیں۔“ عاشر نے بتایا۔ ”جب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا تو پھر ہم میں کچھ اختلافات ہو جائیں گے اور ہماری علیحدگی ہو جائے گی۔ تم اپنی راہ پر چلی جاؤ گی اور میں اپنے راستے۔ ہمارے رشتے کے بارے میں ہمارے علاوہ دو لوگ اور جانتے ہوئے۔ ایک خاور اور دوسرے میرے ڈیڈ۔“

فرح پھر سوچنے لگی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ اس کے سامنے نہیں تھا کہ وہ عاشر کی بات مان لے۔ اس کے علاوہ وہ کرتی بھی تو کیا کرتی۔؟

”ٹھیک ہے آپ ان کے علاوہ کسی اور سے بات نہیں کریں گے۔ پہلے آپ دو لاکھ روپے دیں تاکہ میں منظور بیگ کو واپس کر سکوں۔ میں بیس دن کے لیے ایسی اداکاری کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ فرح نے کہا اور گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

منظور بیگ کے پاس دو لاکھ روپے نقد لے کر عاشر کا وکیل پہنچا تھا۔ منظور بیگ اس کے سامنے کوئی چوں چراں نہ کر سکا اور خاموشی سے دو لاکھ روپے کی رقم لے کر وصولی بھی دے دی

اور وکیل کے مجبور کرنے پر وہ کاغذ بھی نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ جب وہ کاغذ فرح نے پڑھا تو وہ دنگ رہ گئی تھی کیونکہ منظور بیگ نے اپنے وکیل کی مدد سے آگے ایسی تحریر لکھوائی تھی کہ جس سے فرح بری طرح سے پھنس سکتی تھی۔ فرح نے وہ کاغذ پھاڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم کر دیا تھا۔ اور اپنے بروقت کے فیصلے پر شکر کیا۔

عاشر نے خاور کو اپنے ساتھ لیا اور فیاض احمد کے دفتر میں پہنچ گیا۔ جب عاشر نے خاور کا تعارف کرایا اور بتایا کہ خاور ایک کمپنی میں ملازم ہے اور اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے تو فیاض احمد اس کے ساتھ بہت اچھے انداز میں ملا اور عاشر سے شکوہ کیا کہ اس نے بہت پہلے اس سے کیوں نہیں ملوایا۔

اگلی بات نے فیاض احمد کو حیران کر دیا تھا۔ وہ کبھی خیرہ نگاہوں سے عاشر کی طرف دیکھتا اور کبھی خاور کی طرف۔ عاشر اپنے گھر میں کس لڑکی کے ساتھ کیا ڈرامہ کر رہا تھا اس نے بتا دیا تھا۔

”یہ تم کیا کرنے والے ہو؟“ فیاض احمد کے منہ سے الفاظ نکلے۔

”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”تم جانتے ہو کہ اس سے گھر میں ایک ہنگامہ ہو سکتا ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”ہنگامہ کیوں ہوگا۔ میں نے تو ماما کی بات کا انکار کیا ہی نہیں۔ وہ انکار ہی تو سننا نہیں

چاہتی ہیں۔ اور پھر ماموں نے بھی تو ایسی حرکت کی تھی۔“ عاشر نے بتایا۔

”لیکن وہ حرکت حقیقت پر مبنی تھی۔“ فیاض احمد نے بلا تامل کہا۔ ”تم ایسا مت کرو۔ اور

کوئی اور حل نکالتے ہیں۔“

”اس حقیقت کو ہم تین کے علاوہ صرف وہ لڑکی جانتی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

فیاض احمد کی حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم

کہ تم ٹھیک کر رہے ہو کہ غلط۔ لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کوئی ایسی گڑبڑ نہ ہو جائے کہ جس سے

گھر کا نظام ہی بدل جائے۔“

”میں گھر کا نظام بدل دوں گا لیکن بہت ہی اچھے انداز میں۔“ عاشر نے کہا۔

”خاور تم اپنے دوست کو سمجھاؤ۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”انکل میں نے ہی تو اسے ایسا کرنے کا مشورہ دیا ہے۔“ خاور نے صاف گوئی کی۔

”ہاں لیکن.....“ فیاض احمد اس کی جانب دیکھ کر چوٹا۔

”ڈیڈ لیکن ویکن کچھ نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔“ عاشر نے کہا۔

”اور اگر بہت کچھ بگڑ گیا تو؟“ فیاض احمد نے باری باری ان کی طرف دیکھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بس میرا ساتھ دیں گے۔“ عاشر نے کہا۔

”فرح بھی ایک ہوشیار لڑکی ہے۔ وہ کچھ بھی بگڑنے نہیں دے گی۔“ خاور بولا۔

”یہ فرح کون ہے۔؟؟“ فیاض احمد نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں متحیر تھیں۔

”فرح وہ ہی لڑکی ہے جو آپ کی بہو کا کردار ادا کرے گی۔“ عاشر نے بتایا۔

”آپ بے فکر ہو جائیں۔ اور محسوس کریں کہ آپ کو کچھ نہیں پتہ ہے۔“ خاور نے آگے

بڑھ کر کہا۔

”یہ میں کیسے محسوس کر سکتا ہوں جبکہ مجھے سب پتہ ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”آپ بس محسوس کریں۔ میرا دل کہتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عاشر نے یقین

دلانے والے انداز میں کہا۔

”اگر تمہارا دل کہتا ہے تو شاید ٹھیک ہی ہو جائے۔ لیکن..... خیر رہنے دو۔“ فیاض احمد کچھ

کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

عاشر نے فرح کو کچھ روپے دیئے تھے تاکہ وہ کسی اچھی بوتیک سے چند اپنے لئے اچھے اور مہنگے سوٹ خرید سکے۔ فرح نے وہ رقم اپنے ہنڈ بیگ میں ڈالی اور پہلے گھر چلی گئی۔ اُس نے اپنا ضروری سامان ایک چھوٹے بیگ میں ڈالا اور گلی کے ایک بڑے مکان میں کام کرنے والی کو بلا کر اپنے تمام کپڑے اُسے دے دیئے۔ خالو اور خالہ اس وقت صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ فرح کر کیا رہی ہے۔

”بس ہو گیا۔ ایک در بند ہوتا ہے تو سو در کھل جاتے ہیں۔“ فرح نے بتایا۔  
 ”تم اکیلی فلیٹ میں کہاں رہو گی۔ ایک اکیلی لڑکی کا رہنا بہت مشکل ہے۔ ایسا کرتے ہیں یہ سارا مکان ہم کرائے پر دے دیتے ہیں اور ساتھ مل کر رہتے ہیں۔“ خالو نے مسکراتے ہوئے تجویز پیش کر دی۔

”تمہارے خالو تو مجھے پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ مجھ سے زیادتی سی ہو گئی ہے۔ یہ تو آج تمہیں روکنے والے بھی تھے۔“ خالو نے مزید لقمہ دیا۔  
 ”ہاں... تم کہیں مت جاؤ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

”لیکن اب مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ویسے بھی آپ میرے چوکیدار ہیں کیا؟ آپ نے میرا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ کل میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا تو میں لاوارث تھی۔ آج کچھ میرے ہاتھ میں آیا ہے تو میرے وارث پیدا ہو گئے ہیں۔ انسان کی قدر کچھ نہیں ہے۔ پیسہ ہی ہے جو ہم کو ایک دوسروں سے ملاتا ہے اور جدا کرتا ہے۔ اس گھر میں آپ رہیں۔ میں آپ لوگوں کیساتھ ایک پل کے لیے بھی نہیں رہ سکتی ہوں۔“ فرح نے یکدم درشت لہجے میں کہا۔

”تم کچھ بھی کہہ لو۔ ہم سے غلطی ہوئی ہے اس لئے ہم چپ رہیں گے۔“  
 ”آپ کا چپ رہنا ہی بنتا ہے۔“ فرح نے کہا اور بغیر ان کی سنے وہ باہر چلی گئی۔ خالو اور خالہ اُسے روکتے ہی رہ گئے تھے۔ اس کے جاتے ہی دونوں کے چہرے لٹک گئے تھے۔ پچھتاوہ ان کے ماتھے سے عیاں ہو گیا تھا۔



فرح نیچے آئی تو اس نے اپنے ہنڈ بیگ سے کچھ تلاش کرتے ہوئے ہزار ہزار نوٹوں کی ایک چھوٹی گڈی نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور اپنی تلاش پرس کے اندر نگاہیں مرکوز رکھ کر جاری رکھی۔ فرح کے ہاتھ میں اتنے نوٹ دیکھ کر خالو اور خالہ کی نگاہیں خیرہ رہ گئی تھیں۔ پھر فرح نے اپنا سراسر ایک طرف جھٹکا اور نوٹ واپس پرس میں رکھ کر بولی۔

”اچھا خالو جی اور خالہ جان میں جا رہی ہوں۔“  
 ”کہاں جا رہی ہو فرح۔؟“ خالو نے یکدم پوچھا۔  
 ”یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ فرح نے بتایا۔  
 ”کہاں رہنے کا انتظام کیا ہے تم نے۔؟“ خالو نے پوچھا۔

”مجھے ایک کمپنی میں جی ایم کی نوکری مل گئی ہے۔ رہنے کے لیے رہائش آنے جانے کے لیے کار اور اچھی سیلری بھی ملے گی۔“ فرح نے خوش ہو کر بتایا۔ یہ سن کر ان دونوں کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اور رال ٹپکنے لگی تھی۔

”کتنی سیلری ملے گی۔؟“ خالو نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ساٹھ ہزار روپے۔“ فرح نے بلا تامل بتایا۔

”ساٹھ ہزار روپے۔؟؟“ خالو اور خالہ کے منہ سے ایک ساتھ حیرت کی آہٹار کے ساتھ نکلا۔

”خالی ساٹھ ہزار روپے نہیں۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے۔“ فرح نے محسوس کیا کہ محض ساٹھ ہزار روپے بتا دینے سے بات نہیں بنی۔ اس لئے اس نے ساتھ ایک لاکھ روپے کا اضافہ کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے جانے کے بعد دونوں میاں بیوی اپنے فیصلے کی آگ میں اس قدر پچھتاکیں کہ سردی میں بھی ان کو اپنے ماتھے پر پسینہ محسوس ہو۔ اتنی تنخواہ کا سن کر دونوں کے منہ ہی نہیں بلکہ آنکھیں بھی کھل گئی تھیں۔ فرح نے مزید کہا۔ ”میں نے اپنے کپڑے کام والی کو دے دیئے ہیں۔ جو ضروری سامان تھا وہ میں نے لے لیا ہے۔ اور جو کمرے میں میں چھوڑ کر جا رہی ہوں وہ خالہ تم رکھ لینا۔“

”فرح..... تم نے بتایا ہی نہیں یہ اچانک کیسے ہو گیا۔؟“ خالو نے پوچھا۔



فرح اس کی طرف طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ”آپ نے بہن بنایا تو مجھے لگا جیسے اب میں لاوارث نہیں رہی ہوں۔“

”یہ میرے دوست کی مجبوری ہے۔ ورنہ ہم ایسا نہ کرتے۔ عاشر بہت اچھا ہے۔ دل کا اچھا ہے دل کا صاف ہے۔ اگر اس کی شادی صبا کے ساتھ ہو جاتی ہے تو پھر میں تو اپنے دوست کو کھو ہی دوں گا ایک ہا پ بھی اپنے بیٹے کو نہیں پاسکے گا۔“ خاور نے کہا۔

”میں ان کی مجبوری سمجھتی ہوں۔ میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“ فرح نے کہا۔  
”نہیں میں جا رہا ہوں۔ عاشر نے مجھے بھیجا تھا کہ میں پوچھ لوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

”میں نے فریج دیکھی ہے سب کچھ ہے۔ خاور بھائی۔“ فرح نے مسکرا کر کہا۔

”اب تم آرام کرو۔ کل تمہیں گتھ بیگم کے گھر ایک نئے روپ سے جانا ہے۔ اپنا اعتماد بحال رکھنا۔ جانے سے پہلے عاشر تمہیں بہت کچھ بتائے گا اسے یاد رکھنا۔ گڈ نائٹ۔“ خاور نے کہا اور چلا گیا۔ فرح نے دروازہ مقفل کیا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لیتے ہوئے اپنے آپ سے بولی۔

”فرح نواز..... تیار ہو جاؤ..... بیس دن اُن لوگوں کے ساتھ گزارنے کے لیے جو دولت مند لوگ کہلاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ تم بیس دن انتہائی مزے سے اور آرام و عیش سے گزارو گی۔ مزہ آئے گا۔“ فرح کے چہرے پر کوئی خوف کوئی ڈر اور کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ ذہنی طور پر بالکل تیار تھی۔ اور پُر اعتماد تھی۔ اور جو فیصلہ اس نے عاشر کا ساتھ دینے کا کیا تھا اس کا خیال تھا کہ اس نے بروقت ٹھیک فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے سوچا مجبوری ایک ایسی تلوار ہے، بعض اوقات اس کی دھاری پر چلنے سے ہی مجبوری کے پار اُترا جا سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

صبا عظیم کا قہقہہ بہت بلند تھا۔ اس کی گونج پورے کمرے میں سنائی دی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ ہنستے ہوئے اس کی گردن اور بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ نادیہ کے گھر میں اس کے

فرح سیدھی اس فلیٹ میں گئی تھی جس کی چابی عاشر نے اُسے دی تھی۔ اپنا بیگ رکھ کر فرح نے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ فلیٹ میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ سجا سنورا فلیٹ دیکھ کر فرح کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ سوچنے لگی زندگی گزارنے کے لیے اب دولت اور چھت کس قدر ضروری ہو گئی ہے۔ کچھ پانے کے لیے بعض اوقات کچھ کٹھن فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں۔

فرح نے اپنے بیگ سے اپنی امی اور ابو کی تصویر کا فریم نکال کر ایک جگہ رکھا اور اُسے بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ باہر چلی گئی۔ اس نے ایک اچھے بوتیک سے شاپنگ کی اور پھر واپس آ گئی۔ شام کو خاور آ گیا۔

”کیسا لگ رہا ہے۔؟“

”کیا۔؟؟“ فرح نے پوچھا۔

”یہاں آنا۔ شاپنگ کرنا۔ سب کچھ بدلا ہوا دیکھ کر۔“ خاور نے کہا۔

”مجھے جاب جیسا ہی لگ رہا ہے جس کی سیلری مجھے کام ہو جانے پر مل جائے گی۔“ فرح

نے بتایا۔

خاور ہنسا۔ ”گڈ..... تم مجھے خاور بھائی کہہ سکتی ہو۔ ایک شگفتہ کو بہن بنایا ہے اور دوسری تم بہن بن جاؤ۔ ہماری فیملی پوری ہو جائے گی۔ ایک بھائی دو بہنیں۔“

دھڑکن

کمرے میں تھی۔ نادیہ ایک طرف بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

”بہت خوش ہو۔ کیا بات ہے آتے ہی ایک قبضہ لگا دیا ہے۔“ نادیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بات ہی ایسی ہے۔“ صبا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیسی بات ہے۔ مجھے بھی تو پتہ چلے۔“ نادیہ نے پوچھا۔

”آج مجھے آنٹی نے بلایا تھا۔ کہنے لگیں کہ اپنی پسند کی منگنی کی انگوٹھی خرید لو۔ میں ان کے ساتھ جیولر کی دکان پر گئی تھی۔“ صبا نے بتایا اور اپنے چہرے پر ایک مسکراہٹ سجا کر نادیہ کی طرف دیکھا۔ نادیہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ پھر بولی۔ ”میں نے اپنی پسند کی ایک انگوٹھی خریدی ہے۔ اتنی خوبصورت کہ غضب کی انگوٹھی ہے۔ دیکھو گی تو تمہارا دل بھی چاہے گا تمہاری منگنی ہو جائے۔“ صبا نے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

”پہلے بات تو پوری کر لو پھر ہنس بھی لینا۔“ نادیہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔

”ہیروں کی انگوٹھی ہے۔ چمکتے ہیرے۔“ صبا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

بتایا۔

”لیکن اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے۔؟“ نادیہ نے کہا۔

”ہنس رہی ہوں کہ میں نے خاص طور پر ایسی انگوٹھی کا انتخاب کیا ہے جو چاکلیٹ کے ایک میں بچی ہوئی واضح دکھائی دے۔ سفید ہیروں کی انگوٹھی چاکلیٹ میں بچی کتنی اچھی لگے گی۔“ صبا نے جیسے نظارہ لیتے ہوئے کہا۔

”صبا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہوگا۔؟“ نادیہ نے پوچھا۔

”ہاں... کیونکہ آفتاب کو میں جانتی ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ آفتاب میرے پاس آئے گا۔“ صبا کے لہجے میں یقین تھا۔

”جب تمہیں یقین ہے تو پھر تم یہ سب کیوں کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ کل کو اگر تم انگوٹھی واپس کرو گی تو اس فیملی کا کیا ہوگا۔؟ کتنی بے عزتی محسوس کریں گے وہ لوگ۔ تم دو خاندانوں

دھڑکن

میں ان بن بھی ہو سکتی ہے۔ آخر آنٹی تمہارے پاپا کی سگی بہن ہیں۔“ نادیہ نے کہا۔ ”تم ایسا کیسے سوچ سکتی ہو۔ وہ کوئی غیر نہیں ہیں۔ عاشر ایسا لڑکا نہیں ہے کہ اسے کوئی دکھ دیا جائے۔ وہ بہت مختلف اور الگ ہے۔“

”جو ہوتا ہے ہو۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ پاپا آفتاب کو خود بہت پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کا ذہن ایک اچھے بزنس مین کا ہے۔ اور ذہین بزنس مین پاپا کو اچھے لگتے ہیں۔ وہ ان سے مل بھی چکے ہیں۔ جب آفتاب آئے گا تو پاپا اس سے مل کر بہت خوش ہونگے۔“ صبا نے کہا۔

”عاشر بھی ایک اچھا بزنس مین ہے۔“ نادیہ نے کہا۔

”لیکن آفتاب جیسا اچھا نہیں ہے۔“ صبا نے بلاتال کہا۔

”تو پھر کیوں اس سے منگنی کر رہی ہو۔ جوڑ کی اسے پسند کرتی تھی اسے کرنے دیتی اس سے منگنی۔“ نادیہ نے کہا۔

”اس سے تو ضد ہوئی تھی۔“ صبا مسکرائی۔ ”وہ ایک الگ کہانی ہے۔ اسے بچ میں مت لاؤ۔“

”چھوڑو یہ بچکانہ باتیں۔“ نادیہ نے کہا۔

”یہ باتیں میں نہیں چھوڑ سکتی۔ عاشر کے آفس میں گئی تھی۔ اس نے مجھے وقت دینے کی بجائے میٹنگ کا بہانہ کیا اور نکل گیا۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں۔ مجھ پر طنز کرتا ہے۔“ صبا نے کہا۔

”فرض کرو صبا۔ اگر آفتاب تمہیں نہیں اپناتا۔۔۔۔۔“ نادیہ نے کہنا چاہا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔“ صبا نے جھٹ سے کہا۔

”فرض کر لو ایسا ہو جاتا ہے تو پھر تم عاشر کو اپنا لو گی۔؟“ نادیہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

صبا نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ خاموشی کے بعد کہا۔ ”پھر بھی نہیں۔“

”پھر بھی نہیں کیوں۔؟“ نادیہ کی حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

”جب مجھے پتہ چلا تھا کہ فضیلہ عاشر کو پسند کرتی ہے تو میں ان کے بیچ ضد میں کود گئی تھی۔ لیکن یہ حقیقت مجھ پر بعد میں کھلی کہ آنٹی مجھے اپنی بہو کیوں بنانا چاہتی ہیں۔“ صبا نے کہا

اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”وہ کیوں تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔؟“ نادیا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس کی حیرت بھری نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔

”آنٹی نے تمہاری ماما کے ساتھ ایک شرط لگائی ہوئی ہے۔“ صبا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انکشاف کیا۔ ”اور شرط بھی ایسی ویسی نہیں ہے۔ اگر تمہاری ماما ہار گئی تو وہ اپنا فارم ہاؤس آنٹی کے نام کر دیں گی۔ اور اگر آنٹی ہاری تو شہر کے دل میں موجود ان کی کاروں کا شوروم جس کی دیکھ بھال ان کا میئنجر کرتا ہے، وہ تمہاری ماما کے نام لکھوا دیں گی۔ اور یہ شرط لگی ہے میرے انکل کے سامنے جو خود بھی اس معاملے میں ان کے ساتھی ہیں۔ اور دونوں نے شرط لگانے کے بعد اپنی اپنی اس پر اپنی کے کاغذات انکل کے حوالے بھی کر دیئے ہیں۔ اب ہار اور جیت کا انتظار ہے۔“

نادیا کے لئے اس حقیقت کا منکشف ہونا انتہائی حیرت کا باعث تھا۔ اس کی خیرہ آنکھیں اور کھلا منہ صبا کی طرف متوجہ تھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ نادیا جانتی تھی کہ اس کی ماما اور نگہت بیگم کی دوستی ہے۔ اور دوستی کی بنیاد بھی واضح تھی۔

صبا مسکرائی اور نادیا کی طرف اپنی گردن گھما کر بولی۔ ”تم کیا سمجھتی ہو؟“ آنٹی اور تمہاری ماما کو گھوڑوں کی ریس پر شرط لگانا بہت پسند ہے۔ دونوں ریس پر شرطیں لگاتی ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کے خلاف اور کبھی ایک ساتھ مل کر۔ گھوڑوں پر ہی نہیں کبھی کبھی دونوں کسی پر بھی شرط لگاتی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے ہارتی اور جیتی رہتی ہیں۔ کسی بات پر بھی شرط لگانا ان کی جیسے ایک عادت سی ہے۔ کیونکہ دونوں کے پاس اپنا ذاتی پیسہ بہت ہے۔ اس لئے انہیں کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔“

”ہاں میں یہ جانتی ہوں۔“ نادیا نے کہا۔

”آنٹی اور تمہاری ماما کی نظر میں میں بھی ایک گھوڑی ہوں۔ ایسی منہ زور گھوڑی جس کے بارے میں سارا خاندان جانتا ہے۔ مجھے کوئی لگام نہیں دے سکتا ہے۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ اپنے دل کی غلام ہوں۔ کسی کی بھی پابند نہیں ہوں۔ کوئی بھی مجھے اپنے طریقے

سے نہیں چلا سکتا ہے۔ اور نہ ہی مجھ پر کوئی من مرضی کر سکتا ہے۔“ صبا نے کمرے میں نادیا کے ارد گرد چلتے ہوئے کہا۔

”ہاں ایسا تمہارے بارے میں سب ہی جانتے ہیں۔ آج تم نے مجھے اپنی باتوں سے حیران کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں۔ لیکن شرط کیا ہے۔؟“ نادیا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”دو دن پہلے میں نے تمہاری ماما اور آنٹی کی باتیں سن لی تھیں۔ ورنہ شاید مجھے بھی کبھی پتہ نہ چلتا۔“ صبا نے کہا۔ ”تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں فون کیا تھا کہ مجھے کچھ نئے ڈیزائن کے اسپرڈرز کار ہیں تو تم نے کہا تھا ابھی میرے گھر چلی جاؤ تمہارے کمرے کی میز کے اوپر ہی پڑے ہیں۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ نادیا جاننے کے لیے مضطرب تھی۔

”ویسے تو مجھے تم پر اعتماد ہے کہ تم کسی سے ہم دونوں کے درمیان ہونے والی بات نہیں کرتی ہو لیکن پھر بھی میں تم سے کہوں گی کہ اس بارے میں کسی کے کان میں بھنک تک نہ پڑے۔“ صبا نے کہا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں بھول کر بھی کسی سے بات کروں۔“ نادیا نے کہا۔

”تمہاری ماما نے آنٹی سے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ مجھے اپنی بہو بنا کر دکھائے۔ یہ شرط تب لگی تھی جب فیصلہ سے ضد کی صورت میں میں نے خود عاشر کے لیے اظہار نہیں کیا تھا۔ تمہاری ماما جانتی تھی کہ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ مجھ پر لگام ڈالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور آنٹی کو یہ گھمنڈ ہے کہ وہ جس پر ہاتھ رکھ دے اسے اپنی چیز بنا کر چھوڑتی ہیں۔ جب میں نے خود اس کا اظہار کر دیا تو آنٹی خوش ہو گئی تھی۔ اس دن میں نے خود سنا کہ تمہاری ماما اب بھی کہتی ہے کہ پانسہ پلٹ جائے گا۔ جبکہ آنٹی نے پانسے سے منگنی کے پندرہ بیس دنوں کے بعد شادی کے لیے زور دے دیا تھا جو کہ پانچ ماہ گئے تھے۔ ہار جیت کا فیصلہ میری شادی ہونے یا نہ ہونے پر ہی ہوگا۔“ صبا نے تفصیل سے بتایا۔

”اتنی بڑی شرط لگی ہوئی ہے تم پر۔؟“ نادیا کی حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔ ”اور کتنی فضول شرط ہے۔“

دھڑکن

”دیکھ لو مجھے انہوں نے نگاہ میں کیا اور شرط لگالی۔ آنٹی کو تو شکست ہوگی ہی۔“ صبا نے کچھ توقف کے بعد نادیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہاری ماما کو بھی میں جیتنے کی صورت میں وہ شوروم لینے نہیں دوں گی۔ تب تم دیکھنا میں کیسا مہرہ کھیلتی ہوں۔“

”تب تم کیا کرو گی۔؟؟“ نادیدہ نے فوراً پوچھا۔

”یہ تم تب دیکھنا۔“ صبا نے معنی خیز مسکراہٹ سجا کر کہا۔

”ماما کو ایسی شرط نہیں لگانی چاہئے تھی۔ یہ غلط ہے۔“ نادیدہ بولی۔

”تم اپنی ماما سے کوئی بات نہیں کرنا۔ اگر مجھے پتہ چلا تو یاد رکھنا میں اسی دن تم سے اپنی دوستی ختم کر دوں گی۔“ صبا نے کہا۔

☆.....☆.....☆

عاشق کی منگنی کے تمام انتظامات نگہت بیگم نے کر دیئے تھے۔ کل رات کو عاشر اور صبا کی منگنی تھی۔ نگہت بیگم کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ خود نادیدہ کی ماما زریں خان کے پاس منگنی کا کارڈ لے کر گئی تھی۔ زریں خان نے کارڈ کھول کر دیکھا اُسے مسکراتے ہوئے پڑھا اور پھر ایک طرف رکھ کر کہا۔ ”صورتِ حال بہت دلچسپ ہوگئی ہے۔“

”وہ کیسے۔؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”صبا کی منگنی عاشر سے ہو رہی ہے اور ہم دونوں میں سے ایک کی طرف شکست ریختی ہوئی بڑھ رہی ہے۔“ زریں خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نگہت بیگم نے ایک قہقہہ لگایا۔ ”اور تم کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ شکست کس کی طرف بڑھ رہی ہے۔“

”ہاں یہ اندازہ ہے مجھے۔“ زریں خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”منگنی کے بیس دنوں کے بعد عاشر اور صبا کی شادی ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔ گویا اس نے خبردار کیا ہے۔

دھڑکن

”برابر میں دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ہار جیت کا فیصلہ ہونے میں بیس سیکنڈ بھی بہت ہوتے ہیں نگہت بیگم۔“ زریں خان نے اپنی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر پیوست کئے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اب تو تمہیں ایسی اُمید چھوڑ دینی چاہئے۔“ نگہت بیگم نے کہا اور مسکرائی۔

”کچھ بھی ہونے کی اُمید ہمیں آخری لمحے تک نہیں چھوڑنی چاہئے۔“ زریں خان نے کہا۔ ”لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم صبا کو اپنی بہو بنا رہی ہو۔“

”تم وقت سے پہلے آ جانا۔ ہم گپ شپ کریں گے۔“ نگہت بیگم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”میں سب مہمانوں سے پہلے آ جاؤں گی۔“ زریں خان بھی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور نگہت بیگم مسرت سے لبریز وہاں سے چلی گئی۔ جب وہ اپنی دوسری دوستوں کو کارڈ دے کر واپس گھر پہنچی تو ٹی وی والا رنج میں عاشر کے سوا سب ہی گھر والے موجود تھے۔ نگہت بیگم کو دیکھتے ہی فیاض احمد نے اپنی جگہ سے پہلو بدلتے ہوئے اپنے دونوں بیٹوں اور پھر ان کی بیویوں کی طرف دیکھا۔ نگہت بیگم نے فیاض احمد کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں تو اپنی تمام دوستوں کو کارڈ دے آئی ہوں۔“ نگہت بیگم نے سب کی طرف دیکھا اور خاموش چہرے دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ اتنی خاموشی کیوں ہے۔“

”خاموشی نہیں انتظار ہے۔“ مناہل نے کہا۔

”کس کا انتظار ہے۔“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”عاشر نے کچھ دیر پہلے ہم سب کو یہاں جمع کیا اور کہا کہ ہم اس کا انتظار کریں۔ وہ ہمیں ایک سرپرائز دینے والا ہے۔“ مناہل نے بتایا۔ ”ہم اس کے سرپرائز کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ آگئی ہیں شاید اب سرپرائز آ جائے۔“

”کیا سرپرائز ہے۔؟“ نگہت بیگم نے فیاض احمد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں خود اس کے انتظار میں ہوں۔“ فیاض احمد نے لاعلمی کا اظہار کیا۔



دھڑکن

”ہلاؤ اسے مجھے اور بھی کام ہیں۔“ نگہت بیگم نے ناگواری سے کہا۔

اسی اثنا میں عاشر بھی آ گیا تھا۔ ”مجھے آپ کا ہی انتظار تھا ماما۔ بس میں دو منٹ میں

آیا۔“ عاشر نے کہا اور جانے کے لیے پلٹا۔

”تم کیا سر پرانز لئے پھر رہے ہو۔؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”وہ جو میں بتانا چاہتا تھا لیکن آپ نے سنا نہیں تھا۔“ عاشر نے کہا۔ فیاض احمد کو ڈر سا

لگ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر اولیس اور کا شان بھی حیران ہوئے تھے۔ منابل اور سبینا کی

حیرت تو پہلے ہی بڑھی ہوئی تھی۔

فرح کچھ دیر پہلے ہی کار میں بیٹھ کر اس عالیشان بنگلے میں آئی تھی۔ عاشر اسے تیزی سے

اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ کوئی بھی فرح کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ جب فرح نے اس بنگلے میں قدم

رکھا تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ عاشر کے پیچھے جا رہی تھی تو اس کی نگاہ نے جو بھی اس بنگلے

میں دیکھا اس کے لیے حیرت کا باعث ہی تھا۔ ایسی خوبصورتی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی

تھی۔ اور جب وہ عاشر کے کمرے میں گئی تو اس کی خیرہ نگاہیں اس کا کمرہ ہی دیکھتی رہ گئی

تھیں۔ اتنا کشادہ کمرہ اور اس میں بھی ہوئی ضرورت کی چیزیں دیوار پر نصب بڑی اسکرین کا

اٹل سی ڈی ٹی وی، بیڈ اتنا خوبصورت کہ جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئی ہو۔ عاشر چلا گیا تھا لیکن

وہ کمرے کی ہر چیز کو دیکھے جا رہی تھی۔

نگہت بیگم نے ایک بار پھر عاشر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”چلو جلدی کرو۔ میں نے ایک

کام اور بھی جانا ہے۔“

”ابھی آیا۔“ عاشر نے کہا اور اس جگہ سے چلا گیا۔ کمرے میں جا کر اس نے فرح کو کچھ

ہدایات دیں اور اپنے ساتھ لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ فرح اس کے پیچھے ایسے چل رہی تھی

جیسے عاشر اور خاور نے کہا۔ لیکن وہ چورنگا ہوں سے ادھر ادھر رکھی چیزیں فرنیچر وغیرہ دیکھتی

ہوئی جا رہی تھی۔ عاشر اسے لے کے ٹی وی الاؤنچ میں چلا گیا۔ عاشر کے برابر میں کھڑی فرح

خوبصورت لباس اور ہلکے میک اپ میں کسی پری سے کم نہیں لگتی تھی۔ عاشر کے ساتھ ایک لڑکی کو

کھڑی دیکھ کر سب تو چوکے ہی تھے لیکن نگہت بیگم تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی متحیر نگاہیں

دھڑکن

فرح کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ فرح نے ان سب کی طرف باری باری دیکھ کر ٹی وی الاؤنچ کی

سجاوٹ کو چورنگا ہوں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا سجا ہوا کمرہ اس نے پہلی بار دیکھا

تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود جاگتی ہوئی اس بنگلے کے ٹی وی الاؤنچ میں کھڑی ہے۔

”یہ کون ہے۔؟؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”برکت۔“ اس سے پہلے کہ عاشر کوئی جواب دیتا۔ فیاض احمد نے اپنے خشتک گلے سے

نوکر کو آواز دی اور اسے پانی لانے کے لیے کہا۔ برکت جلدی سے پانی لے آیا تھا۔ فیاض احمد

گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پینے لگا تھا۔

”میں نے پوچھا ہے کہ یہ کون ہے۔؟“ نگہت بیگم نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

”اس کا نام فرح ہے۔“ عاشر نے بتایا۔

”یہاں کیا کر رہی ہے۔؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

عاشر نے ایک نظر فرح کی طرف دیکھا۔ فرح چورنگا ہوں سے ایک خوبصورت پینٹنگ

کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی عاشر نے اس کی طرف دیکھا تھا اس نے فوراً اپنی نگاہیں اس

جگہ سے ہٹالیں تھیں۔ عاشر نے کہا۔ ”اب یہ یہاں ہی رہے گی۔“

”ملازمہ کی حیثیت سے؟؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔ فیاض احمد نے ایک بار پھر پانی کا

ایک گھونٹ بھرا اور اپنا خشتک ہوتا ہوا گلا تر کیا۔

”نہیں۔“ عاشر نے نفی میں گردن ہلائی۔

”تو پھر...؟؟“ نگہت بیگم اپنی جگہ سے عاشر کے سامنے آ گئی۔

”اس گھر کی... بہو کی حیثیت سے۔“ عاشر کے اس انکشاف نے نگہت بیگم سمیت

منابل، سبینا، اولیس اور کا شان کو بھی بری طرح سے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ جبکہ فیاض احمد کا وہ

گھونٹ جو اس کے حلق سے نیچے جا رہا تھا یکدم محسوس ہوا کہ وہ گلے میں پھنس رہا ہے۔ فرح

اطمینان سے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تردد یا کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ وہ ذہنی طور پر تیار

تھی۔ اسے تو اس بنگلے میں ہی آ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”تم ہوش میں تو ہو۔؟“ نگہت بیگم سیخ پا ہو کر چیخی۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔؟“

”تم اپنی ماں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چلے جاؤ گے۔“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں ایسا نہیں چاہتا۔ لیکن آپ مجبور کر رہی ہیں۔“ عاشر نے کہا۔

”نگہت پلیز... اپنے غصے پر قابو کرو۔ اس لڑکی کو... کیا نام ہے اس کا...؟“ فیاض احمد نے پھر مداخلت کی۔

”فرح۔“ عاشر نے بتایا۔

”ہاں فرح کو ہم نکال بھی نہیں سکتے ہیں۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”کیوں نہیں نکال سکتے۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہمارا گھر ہے۔ یہ

میرا گھر ہے۔ اس لڑکی کا یہاں کیا کام۔“

”اس لئے کیونکہ جیسی ہمارے لئے منال اور سینا ہے ویسی یہ فرح ہے۔“ فیاض احمد نے

نرمی سے اپنی آواز آہستہ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ ان جیسی نہیں ہے۔“

”مما پلیز... اب آپ چلائیں مت۔ اس طرح کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ڈیڈ ٹھیک کہہ رہے

ہیں کہ اب ہم اسے باہر نہیں نکال سکتے۔۔۔ کیونکہ وہ عاشر کے ساتھ آئی ہے۔ ان کا نکاح

ہو چکا ہے۔“ اولیس نے جلدی سے مداخلت کی۔ نکاح کی بات سن کر ایک نظر فرح نے عاشر کی

طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر اولیس پر مرکوز ہو گئی۔ اولیس نے کہا۔ ”اگر آپ عاشر کو پہلے بولنے

کا موقع دے دیتیں تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔“

”فرح اب یہیں رہے گی۔ ہم سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔“ فیاض احمد نے جلدی سے کہا۔

”کل عاشر کی منگنی ہے۔ پورے خاندان کو پتہ چلے گا کہ عاشر نے اپنی مرضی سے نکاح

کر لیا تو ہماری عزت کیا رہ جائے گی۔“ نگہت بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔ اُسے اپنی عزت سے

کہیں زیادہ زریں خان سے لگی شرط ہارنے کی فکر تھی۔ ”آج ہم نے اس کی منگنی کے کارڈ تقسیم

کرنے تھے۔“

”ہماری عزت کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہم سب سنبھال لیں گے۔ کسی کو یہ بتائیں گے ہی نہیں

دھڑکن  
کہ عاشر نے ایسا کام کر لیا ہے۔ ہم فی الحال کچھ دنوں کے لیے منگنی روک دیں گے۔ ابھی ہم  
نے محض چند گھروں میں ہی تو کارڈ تقسیم کئے ہیں۔“ فیاض احمد نے ایک بار پھر سمجھانے کے  
انداز میں کہا۔

”منگنی کل ہی ہوگی۔“ نگہت بیگم یکدم اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

”میری بات سن لو۔ ہم کوئی اچھا بہانہ بنائیں گے اور منگنی روک دیں گے۔ تسلی سے اس

معاملے پر غور کریں گے اور اس کے بعد جو بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا۔“ فیاض احمد نے کہا۔ نگہت بیگم

کی سمجھ میں بھی یہ بات آ رہی تھی کہ اگر اس نے اور زور دیا تو عاشر بھی فرح کے ساتھ چلا جائے

گا۔ پھر بھی صبا سے منگنی کی تقریب نہیں ہو سکے گی۔ حکمت اسی میں تھی کہ وہ چپ ہو جائے۔

”ڈیڈ کی بات میں دم ہے ممما۔ یہ معاملہ ابھی اس چار دیواری میں ہے۔ آپ کا غصہ اگر

اسے باہر لے گیا تو پھر ٹھیک نہیں ہوگا۔“ پہلی بار کا شان نے زبان کھولی۔ ”اگر عاشر نے ایسا کر

ہی لیا ہے تو چیخنے چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور واقعی ہم نے چند کارڈ ہی تو دیئے ہیں۔ وہ بھی

نادینے کے برابر۔ کارڈ کی تقسیم تو آج سے شروع ہوئی تھی۔“

تم کہتے ہو کہ چیخنے چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے میری مرضی کے خلاف یہ قدم

اٹھایا ہے۔ اس کی منگنی کل رات کو ہے۔ کل رات سے پہلے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ لڑکی اپنے

گھر جاسکتی ہے۔ اور اس کی منگنی صبا سے ہو سکتی ہے۔“ پہلی بار نگہت بیگم نے آہستہ لہجے میں

بات کی تھی۔ البتہ غصہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

فیاض احمد نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے نگہت بیگم کو سمجھا کر کچھ ٹھنڈا کر دیا تھا۔ لیکن

نگہت بیگم کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ اس لڑکی کو اس گھر سے چلتا کر دیں اور کسی بھی قیمت پر منگنی

کل کی تاریخ سے آگے نہیں جائے گی۔ فیاض احمد نے ملازمہ کو بلا کر کہا کہ وہ فرح کو کمرے میں

لے جائے۔ اور یہ بھی بتایا کہ فرح کو کس کمرے میں لے کر جانا ہے۔ ملازمہ فرح کو اس کمرے

میں لے گئی تھی جس کے بارے میں فیاض احمد نے کہا تھا۔

نگہت بیگم اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ اسے تشویش تھی کہ عاشر نے یہ قدم کیوں

اٹھایا ہے۔ اُسے زریں خان کے وہ الفاظ بھی یاد آ گئے تھے جب اس نے کہا تھا کہ برابر میں

”ایسا ہی ہوگا۔ ہم سب سوچیں گے۔“ فیاض احمد نے کہا۔  
 ”عاشر نے ٹھیک نہیں کیا۔“ نگہت بیگم نے تاسف سے کہا۔

☆.....☆.....☆

”عاشر نے تو وہ کر دیا جس کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کمال ہے۔“ مناہل جیسے ہی اپنے کمرے میں آئی اس نے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔

”اس نے مجھ سے بھی ذکر نہیں کیا۔“ اولیس ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔  
 ”اگر وہ آپ کو بتاتا تو آپ کیا کرتے؟“ مناہل نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

اولیس سوچنے لگا۔ ”میں اُسے ایسا کرنے سے منع کرتا۔“  
 ”اور وہ منع کسی بھی قیمت پر نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ صبا سے منگنی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔“ مناہل نے کہا۔ ”اور ماما سے آپ بات کر نہیں سکتے تھے۔ اس لئے اس نے سوچا کہ کسی سے بھی بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس نے یہ قدم اٹھا لیا۔“  
 ”اب کل کے لیے ہم کیا بہانہ سوچیں۔؟“ اولیس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ویسے بھی سوچنے کے لیے ڈیڈ ہیں ناں۔“ مناہل نے کہا۔ اس کے ماتھے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔

”ہمیں بھی سوچنا ہوگا۔“ اولیس نے کہا۔

”میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ فرح ہے کون۔؟ کس خاندان سے ہے۔؟ کس بڑے باپ کی بیٹی ہے۔؟ میں تو یہ جانتا چاہتی ہوں۔“ مناہل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ایسی ہی باتیں کا شان اور سبنا بھی کر رہے تھے۔

”ماما کا غصہ اب ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ یہ کام ان کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس گھر میں جنگ کا ماحول بن جائے گا۔“ سبنا نے کا شان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ہار جیت کا فیصلہ ہونے کے لیے ہیں سیکنڈ بھی بہت ہوتے ہیں۔ نگہت بیگم کو لگا کہ اس کا کاروں کا شوروم اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس جگہ ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی بھی بول نہیں رہا تھا بس ایک دوسرے کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ عاشر آگے بڑھا اور نگہت بیگم کے سامنے فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ بولا۔

”مجھے افسوس ہے ماما میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ لیکن آپ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔“

”مجھے یہ بات بار بار مت سناؤ۔ اور اس لڑکی کو چھوڑ کر آؤ۔“ نگہت بیگم نے پھر حکمانہ انداز میں کہا۔

”مجھے ایسا حکم نہ دیں۔“ عاشر نے رک کر سعادت مندی سے کہا۔ ”ورنہ میں بھی مجبوراً اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔“

نگہت بیگم نے فوراً فیاض احمد کی طرف دیکھا۔ ”سن رہے ہو تم یہ کیا کہہ رہا ہے۔“  
 فیاض احمد نے عاشر کو یہاں سے جانے کے لیے کہا اور پھر بولا۔ ”ہم نے کہا ناں کہ یوں بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کل ہم منگنی کی تقریب نہیں کریں گے۔ معاملہ سلجھانے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ ورنہ عاشر بھی اس کے ساتھ چلا جائے گا۔ پھر کیا کرو گی تم۔؟ ہاں سوچو پھر کیا کرو گی۔؟ اس کے جانے کے بعد کیا تم پھر بھی منگنی کرو گی۔ کیسے کس کے ساتھ۔؟“

”ڈیڈ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ معاملہ اور الجھ جائے گا ماما۔“ اولیس نے بھی اتفاق کیا۔ نگہت بیگم نے بھی سوچ لیا تھا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے، مناہل اور سبنا نے بھی یہی سمجھا یا تھا۔ لہذا وہ یکدم سب کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

”یہ بات اس چار دیواری میں دفن ہو جانی چاہئے۔ جس خاموشی سے عاشر نے یہ سب کیا ہے اسی خاموشی سے یہ معاملہ ختم ہو جانا چاہئے۔ اور کل ناشتے کی میز پر ایسی بات طے ہو جانی چاہئے کہ جس کے کرنے سے کسی کو شک بھی نہ پڑے کہ ہمارے گھر میں کیا ہوا ہے۔ اور کس لئے ہم نے منگنی کی تاریخ کچھ آگے کی ہے۔“

دھڑکن

”مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ عاشر نے اتنا بڑا قدم اچانک اٹھا لیا۔“ کا شان نے کہا۔

”ایک طرح سے عاشر کہتا بھی ٹھیک ہی ہے۔ ممانے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ صبا سے منگنی کرنے پر تو رضامند تھا ہی نہیں۔“ سینا نے کہا۔ ”مما اس کی بات سن لیتیں تو اچھا تھا۔“

”وہ مجھ سے بات کر لیتا۔“ کا شان نے کہا۔

”پھر آپ کیا ممما سے بات کرتے۔؟؟“ سینا نے اس کی طرف دیکھا۔

”بات نہیں کر سکتا تھا لیکن شاید کوئی صورت نکل آتی۔“ کا شان نے کہا۔

”پھر بھی کوئی صورت نہ نکلتی۔ اس کا شاید یہ ہی حل تھا جو عاشر نے کیا ہے۔“ سینا نے

کہا۔

کا شان چپ ہو کر سوچنے لگا۔ یکدم سینا نے کا شان کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”یہ فرح ہے کون۔؟ کس خاندان سے ہے۔؟ اس کا باپ کوئی انڈسٹریل ہے یا کیا ہے۔؟ مجھے تو یہ جاننا ہے۔ کہیں وہ ہمارے خاندان سے بھی کسی بڑے خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتی ہے۔ اور فرح کی فیملی اس طرح عاشر سے نکاح کرنے کے لیے تیار کیسے ہوگئی۔ کوئی ان کے درمیان نہیں آیا۔؟ فرح کا باپ ماں بہن یا بھائی.... یا سب اتنے رضا مند تھے کہ انہوں نے خوشی خوشی جیسا انہوں نے چاہا وہ کرنے کی اجازت دے دی.... یا پھر....؟“ سینا شاید جان بوجھ کر رک گئی تھی۔

”یا پھر کیا۔؟؟“ کا شان نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”یا ان دونوں نے چوری چھپے نکاح کر لیا ہے۔؟“ سینا نے کہا۔ اس کی بات سن کر

کا شان بھی سوچنے لگا تھا۔ ان چاروں کے دماغ میں بہت سے سوالات تھے۔ لیکن کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

دھڑکن

نگہت بیگم اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی جائے اور فرح کا بازو پکڑ کر اسے اس بنگلے کے گیٹ سے باہر تک چھوڑ آئے۔ اضطراب اور بے قراری اس کے جسم میں خون کے ساتھ دوڑنے لگی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عاشر نے بہت بڑا قدم اٹھا لیا ہے۔ اب وہ کیا جواب دے گیا۔ کیا بہانہ کرے گی کہ یہ منگنی کچھ دنوں تک رک سکے۔ اور عاشر کے ساتھ اسے کیا طے کرنا پڑے گا کہ جس سے وہ فرح کو چھوڑ دے اور اس گھر سے جانے کی بجائے وہ صبا کے ساتھ منگنی کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس معاملے کو سلجھانے کے لیے غصے کی تیز دھاری تلوار کی بجائے ایسے نشتر کی ضرورت تھی کہ جس سے جسم کا حصہ کٹتے ہوئے تکلیف بھی نہ ہو اور احساس بھی نہ جاگے۔

نگہت بیگم کے کمرے میں سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی پینٹنگ لگی ہوئی تھی جس میں دو گھوڑے ایک ساتھ بھاگ رہے تھے۔ نگہت بیگم کی نگاہیں اس پینٹنگ پر مرکوز ہوگئی تھیں۔ اسے لگا تھا جیسے وہ دو گھوڑے نہیں ہیں۔ نگہت بیگم اور زریں خان ہے۔

اس نے اپنی نگاہیں اس پینٹنگ سے ہٹالیں۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے کسی ماہر کھلاڑی کی طرح چال چلنی ہوگی۔ ورنہ وہ بہت کچھ کھونے پر مجبور ہو جائے گی۔ اور وہ کسی بھی قیمت پر کچھ بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اگر فرح کو نکالنے سے عاشر بھی ساتھ ہی چلا گیا تو وہ واقعی سب کا منہ ہی دیکھتی رہ جائے گی۔ تب اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔ وہ محض دیواروں کے ساتھ چلا کر اپنی ناکامی کا غصہ ہی نکال پائے گی۔

فیاض احمد نے موقع ملتے ہی عاشر کے کمرے کا رخ کر لیا تھا۔ فیاض احمد نے عاشر کا بازو پکڑا اور اسے سامنے ٹیرس میں لے گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی ان کی بات سن کر یہ جان لے کہ اسے سب پتہ ہے۔

”اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔ کیا بہانہ تراش کر دینا ہے کہ جس سے تمہاری منگنی فی الحال رک

سکے۔“ فیاض احمد نے پوچھا۔

”آپ بے فکر ہو جائیں۔“ عاشر نے سامنے دیکھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

”میں بے فکر ہو جاؤں۔ میں بھی عجیب باپ ہوں کہ اس عجیب ڈرامے میں ایک عجیب



سا کردار ادا کر رہا ہوں۔“ فیاض احمد نے جیسے خود سے کہا ہو۔

”اچھا نہیں لگا۔؟“ عاشر نے فیاض احمد کی طرف دیکھا۔

”اچھی ضرور لگی ہے۔“ فیاض احمد نے مسکرا کر کہا۔

”ہماری یہ تجویز....؟“ عاشر نے پوچھا۔

”نہیں... فرح۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”ظاہر ہے اسے ایسا بنایا گیا تھا کہ وہ اچھی لگے۔“ عاشر نے کہا۔

”مجھے لگا تھا کہ تمہاری ماما گھر کا سارا سامان غصے سے توڑ دے گی۔ اس چھت تلے ایک

ایسا طوفان برپا ہوگا کہ جسے روکنا مشکل ہو جائے گا لیکن شکر ہے کہ وہ خود ہی بول کر کچھ میرے

سمجھانے پر سنبھل گئی ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”طوفان جس تیزی سے آتا ہے وہ زور رفتہ رفتہ ٹوٹ کر خود ہی ختم بھی ہو جاتا

ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”اب کیا کرنا ہے کیسے منگنی کی رسم کو روکنا ہے۔“ فیاض احمد نے پھر پوچھا۔

”یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے۔“ عاشر نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”تو کس کا کام ہے۔؟“ فیاض احمد نے متحیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جس کا کام ہے وہ تب تک نہیں سوئے گا جب تک اس کے دماغ میں ایسی بات نہ

آجائے جس سے منگنی کی رسم ٹل جائے گی۔ اور وہ میرا کام کر رہا ہے۔“ عاشر نے فیاض احمد کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

فیاض احمد نے عاشر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کون ہے جو ہمارے لئے

اپنی نیند کی قربانی دے رہا ہے۔ اور دماغ کو جگائے ہوئے ہے۔؟ ہماری جگہ وہ سوچ رہا

ہے۔ کون ہے وہ۔؟“

”میرا دوست خاور... اب آپ اطمینان سے سو جائیں۔ صبح ایک اچھا آئیڈیا موجود

ہوگا۔ اور پلیز ملازمہ سے کہہ دیں کہ وہ فرح کا خیال رکھے۔“ عاشر نے کہا اور فیاض احمد اس

کے کمرے سے باہر آ گیا۔

ان سب سے بے نیاز فرح کو جو کمرہ آرام کے لیے دیا گیا تھا وہ اس میں کھوئی ہوئی

تھی۔ وہ بھی ایک کشادہ کمرہ تھا۔ جس میں رکھا ہوا بیڈ ہی اتنا خوبصورت اور قیمتی تھا کہ فرح کی

نگاہ اس سے ہی نہیں ہٹ رہی تھی۔ فرح نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس نے کبھی اتنا بڑا بنگلہ

نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ جس کرائے کے مکان میں رہتی تھی وہ بھی چھوٹا

تھا۔ اور جب وہ اپنے خالو کے گھر آئی تھی تو وہ بھی ایک عام سا گھر ہی تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے

وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جو اس جیسی لڑکی کے سپنوں میں ہوتی

ہے سوچوں کے اڑتے بادلوں میں ہوتی ہے خیالوں کے کہکشاں میں بکھری ہوتی ہے کھلی

آنکھوں کی قوس و قزح کے راستے میں کہیں پوشیدہ ہوتی ہے۔ فرح کو نگہت بیگم کے غصے کی بھی

کوئی پرواہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ اگر اسے گھر سے نکال دیتی ہے تو اسے کیا غم تھا۔ وہ اس گھر میں رہ

کر اچھی طرح سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ فرح نے ایک بڑی کھڑکی سے پردہ ایک طرف

ہٹایا اور باہر دیکھا۔ آسمان پر چمکتے ستارے تھے۔ اس کی کھڑکی سے دور وہ سڑک بھی دکھائی

دے رہی تھی جس پر روشنیاں بکھرتی اور بجھ جاتی تھیں۔ وہ مین سڑک تھی۔ فرح کچھ دیر وہاں

کھڑی رہی اور پھر نرم و نازک بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ وہ نیند کی میٹھی وادی

میں پہنچ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے کسی پہر خاور چڑے کی جیکٹ سر پر منگی کیپ ہاتھوں پر دستاں چڑھائے

عاشر کے بنگلے کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ آنے سے پہلے اس نے عاشر کو فون کیا تھا۔ کچھ دیر بعد

عاشر گیٹ پر آیا تو وہ اسے اندر لے گیا۔ خاور نے اس کے ساتھ جانے سے پہلے اپنی بائیک

سے ایک بیگ بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس کے کمرے میں جاتے ہی اس نے اپنی منگی کیپ اوپر

کی اور بولا۔ ”مجھے بہترین دوست کا ایوارڈ ملنا چاہئے۔ میں نے مسلسل سوچا اور پھر اس سوچ کو

عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے ڈاکٹر دوست کو جگایا وہاں سے سیدھا تمہارے پاس اس

سردی میں آ رہا ہوں۔ شکر کرو مجھے کہیں کسی نے نا کے پر نہیں روک لیا ورنہ تم میری ضمانت

کرانے کے چکر میں ہوتے۔“

”بتاؤ کیا سوچا ہے۔“ عاشر نے پوچھا۔

”یار پہلی بار تمہارے اس عالیشان بنگلے میں آیا ہوں۔ کوئی کافی چائے ناشتہ۔“ خاور نے کہا۔

”ابھی دن کی سرخی نمودار ہونے والی ہے اطمینان سے ناشتہ کریں گے۔“ عاشر نے کہا۔

”پھر خاک اطمینان سے ناشتہ ہوگا۔ گھر کی جو صورت حال تم نے بتائی ہے ایک کچھری لگ جائے گی۔“ خاور نے کہا۔ ”بہر حال مجھے ابھی گھر بھی جانا ہے۔ اور ان ہی جاگتی آنکھوں سے اپنے آفس جا کر کام بھی کرنا ہے۔ میں نے بہت سوچا اور اس سے اچھا حل میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

خاور نے بیگ کی زپ کھولی۔ اس میں سے ایک پلستر کیا ہوا پورے پیر سے لے کر پنڈلی تک کا سانچہ سا نکالا اور عاشر کے سامنے رکھ دیا۔ عاشر نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے۔؟“

”اسے پلستر کہتے ہیں۔ یہ وہ نہیں ہے جو دیواروں پر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ ہے جب کسی کی ٹانگ اور پیر کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو وہاں ڈاکٹر صاحب اسی طرح سے کرتے ہیں جیسے یہ کیا ہوا ہے۔ اور یہ اسے تیار کیا ہے میرے دوست نے میرے مشورے سے جیسے میں نے کہا تھا۔ کسی جوتے کی طرح بہت ہی آسانی کے ساتھ پہنا جاسکتا ہے اور اتارا بھی جاسکتا ہے۔“ خاور نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

”لیکن کرنا کیا ہے۔؟“

”یہ تم اپنے پاؤں پر چڑھا لو اور بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ پورے خاندان میں یہ بات پھیلا دو کے تمہارے پیر کی ہڈی میں اچانک فریکچر ہو گیا ہے۔ چلنا پھرنا دو بھر ہو گیا ہے۔ لہذا یہ ممکن نہیں ہو سکتی ہے۔“ خاور نے کہا۔ ”ڈاکٹر نے ابھی چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔ درد اتنی ہے کہ چل کر دو قدم بھی نہیں جایا سکتا ہے۔ جب دو قدم نہیں چلا جاسکتا تو پھر ممکن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“

”لیکن میں آفس کیسے جاؤں گا۔؟“

”تمہیں ابھی آفس جانا ہی نہیں چاہئے۔ تمہیں اپنی نگاہ میں فرح کو رکھنا ہوگا۔ کہیں گھر والے اس کے ساتھ کوئی ایسا ویسا نہ کر دیں کہ بے چاری ناحق ماری جائے۔ اس بہانے تم گھر میں رہ بھی سکو گے۔“ خاور نے کہا۔

عاشر اس کی بات سن کر مسکرایا۔ ”زبردست.... اچھا ہے۔“

”یہ باتیں پیر کا ہے۔ دائیں پیر میں مت پہن لینا۔ بالکل جوتے کی طرح ہے۔“ خاور نے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے اپنی منگی کیپ پھر سے نیچے کر لی تھی۔ عاشر اسے گیٹ تک چھوڑنے کے لیے گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات بھر نگہت بیگم ٹھیک سے سو بھی نہیں سکی تھی۔ اس لئے وہ منہ اندھیرے اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کا چہرہ اس کے اندر کی کیفیت کا اظہار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد فیاض احمد بھی آ گیا تھا۔ اس نے نگہت بیگم کی طرف دیکھا اور ملازم کو حکم دیا کہ وہ دو کپ کافی کے بنا کر لائے۔ فیاض احمد اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اب بھی پریشان ہو۔؟“

”اب بھی سے کیا مراد....؟ پریشانی کیا ختم ہو گئی ہے۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”جب تک وہ اس گھر میں ہے میری پریشانی ختم نہیں ہوگی۔ مجھے ایک پل کے لیے بھی چین نہیں آئے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم ابھی بھی ریلکس نہیں ہوئی ہو۔“ فیاض احمد نے جلدی سے کہا۔

”عاشر کی یہ حرکت لگتا ہے مجھ سے میرا بھائی چھین لے گی۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”میں نے عظیم بھائی سے ایک بار صبا کی بات کی تھی اور انہوں نے

میری بات کو فوراً سے پہلے مان لیا تھا۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے اس کے کمرے میں جا کر بہت کچھ کہا ہے عاشر کو۔ لیکن سختی

دھڑکن

سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ ہمارا جوان بیٹا ہے۔ بالغ ہے۔ اور پھر شکر ہے کہ دوسروں سے ہماری اولاد بہت اچھی ہے ورنہ ہمارے خاندان کے لڑکے تو اس سے بھی آگے جا کر گھر والوں کو بتاتے رہے ہیں۔“ فیاض احمد نے کہا۔ ”ابھی سب کچھ کنٹرول میں ہے۔ عاشر نے کوئی راستہ نہ دیکھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔“

”مجھے دوسروں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ عاشر نے میرے حکم کے بغیر یہ قدم اٹھایا ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

اسی اثنا میں کافی آگئی تھی۔ فیاض احمد نے ایک گنگہت بیگم کو دے دیا تھا۔ نگہت بیگم نے ایک چسکی لی اورنگ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”تم نے پوچھا کہ فرح کو وہ کب سے جانتا تھا۔؟“

فیاض احمد سوچنے لگا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ ”باتیں ہی اس سے اتنی ہوئی تھیں کہ مجھے یہ پوچھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اب میں پوچھوں گا کہ وہ اسے کب سے جانتا ہے۔“

”اب میں کیا سب سے کہوں گی۔؟“ نگہت بیگم نے کہا۔ اس کے چہرے کا تاسف اپنی شرط ہار جانے کا تھا۔ جس سے فیاض احمد بے خبر تھا۔ نگہت بیگم کھوئی کھوئی سی تھی۔ وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔

”مجھے اُمید ہے کہ کسی نہ کسی نے کوئی حل سوچ لیا ہوگا۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”سب کو ابھی بلا لو۔ میں بے چین ہوں۔“

”ابھی تو کچھ بھی وقت نہیں ہوا ہے۔“ فیاض احمد نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اس وقت سب کو بلانا ٹھیک نہیں ہے۔ تم شاید جانتی نہیں ہو کہ ابھی فجر کی اذان بھی نہیں ہوئی ہے۔“

”ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ تم ابھی بلا لو۔“ نگہت بیگم نے مضطرب ہو کر کہا۔ ”میں چاہتی ہوں ابھی یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ تاکہ میں سورج کی پہلی کرن اطمینان اور سکون کی کھلی آنکھ سے دیکھ سکوں۔“

دھڑکن

فیاض احمد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ابھی سب اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔ دن پوری طرح سے نکل آئے پھر میں سب کو ناشتے کی میز پر اکٹھا کر لیتا ہوں۔ تم اپنے اندر کی بے چینی کو ختم کر دو۔ اور کافی پیو۔“

”بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”پرسکون ہو جاؤ۔“ فیاض احمد نے کہا۔ اور اپنا کافی کا گم لے کر باہر لان میں چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ نگہت بیگم کے پاس بیٹھا رہے گا اسے کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے وہ مجبور کرتی رہے گی۔ وہ کچھ نہ کچھ کہتی رہے گی۔ وہ لان میں کافی پینے کے ساتھ ساتھ چہل قدمی بھی کر رہا تھا۔ اسی دوران فجر کی اذان کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ فیاض احمد پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گیا اور غور سے فجر کی اذان سننے لگا اور ساتھ ساتھ اذان کا جواب بھی دینے لگا۔ اذان ختم ہوئی تو وہ نماز کی ادائیگی کے لیے اندر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

سورج نے اپنی کرنیں پھیلا دیں تھیں۔ فرح جلدی اٹھ جانے کی عادی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ کسی عالیشان بنگلے کے ایک خوبصورت بیڈروم میں ہے۔ جیسے ہی وہ اٹھی اس نے متحیر نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا تھا اور پھر سب کچھ اس کے دماغ میں آ گیا تھا۔

عاشر نے اپنے کمرے سے نکل کر دائیں بائیں دیکھا اور سیدھا فرح کے کمرے کے دروازے کے پاس جا کر آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ کچھ ہی دیر بعد فرح نے دروازہ کھولا تو اس کی رخنے سے آنکھیں نمودار ہوئیں۔ اس نے عاشر کو دیکھتے ہی دروازے کا کچھ اور حصہ کھول دیا تھا۔

”تم ٹھیک ہو۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”میرے ہارے میں کوئی برا خواب دیکھ کر آ رہے ہیں آپ۔؟“ فرح نے پوچھا۔

”میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے۔ تم ٹھیک رہی ہونا۔ کوئی تکلیف کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔“ عاشر نے پھر پوچھا۔ ”کوئی خوف تو نہیں ہے۔ یہاں کمرے میں ٹھیک سے رہ رہی ہو

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ فرح نے جواب دیا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“  
 ”کمرے کی الماری میں تمہارے اور بھی کپڑے میں رکھوا دیئے تھے۔ چیخ کر کے اس وقت آنا جب ناشتے کے لیے تمہیں ملازمہ بلانے کے لیے آئے گی۔“ عاشر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم نے ماما کی کسی بات کا غصہ کر کے کچھ ایسا نہیں کہنا کہ بات بگڑ جائے۔ خاموش رہنا۔“

”مجھے ان کی کسی بات پر غصہ نہیں آ رہا ہے۔“ فرح نے لاپرواہی سے کہا۔  
 ”یہ بہت اچھا ہے۔“ عاشر نے کہا اور وہاں سے پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔  
 ناشتے کی میز پر بھی سب وقت سے پہلے ہی آ گئے تھے۔ دراصل سب ہی رات ٹھیک سے سو نہیں سکے تھے۔ نگہت بیگم کو اپنی پریشانی تھی تو دونوں بہویں یہ سوچ کر اپنی اپنی نیند اڑائے بیٹھی تھیں کہ فرح ہے کون۔؟ جبکہ عاشر کے بھائیوں کی بار بار نیند اس لئے ٹوٹ جاتی تھی کہ اب کیا ہوگا۔؟ اور انہیں کیا کرنا پڑے گا۔ اور فیاض احمد تو اس خوشی میں کہ جہاں وہ عاشر کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے وہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے اور اس فکر میں کہ نگہت بیگم کوئی نیا قانون اس گھر میں کھڑا نہ کر دے، کبھی سوتے اور کبھی جاگتے رہے تھے۔ فرح سب سے بعد میں آئی تھی اس نے آتے ہی بڑے احترام سے کہا۔ ”اسلام علیکم۔“

سلام کا جواب دینے والوں میں فیاض احمد کی آواز سب سے بلند تھی، جبکہ نگہت بیگم نے اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ عاشر نے وہ پلستر کیا ہوا پاؤں کا سانچہ نکالا اور بتانے لگا کہ سب کو اب یہ بتایا جائے گا کہ عاشر کا پاؤں اچانک فریچر ہو گیا ہے۔ چلنا محال ہے اس لئے منگنی نہیں ہو سکے گی۔ چند دن رکنا پڑے گا۔ پھر جیسے ہی ماما رضا مند ہوگی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بات عاشر نے باتوں باتوں میں کہہ دی تھی کہ نگہت بیگم وہ بات ٹھیک سے سمجھ نہیں سکی تھی۔ عاشر سب کچھ بتانے کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ اس نے وہ پلستر سب کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ جو کہ سفید بڑا جوتا ہی معلوم ہوتا تھا۔

اس کی بات سب ہی غور سے سن رہے تھے لیکن اس بات پر متحیر بھی تھے کہ عاشر راتوں

رات یہ کہاں سے اٹھا کر لایا ہے۔؟ فیاض احمد کی حیرت سب سے زیادہ تھی۔ کیونکہ جب وہ اس کے کمرے میں گیا تھا تو تب اس نے ایسا کچھ نہیں بتایا تھا اس کا مطلب ہے کہ رات کے کسی پہر عاشر گیا تھا یا پھر خاور اس کے پاس آیا تھا۔ لیکن خاور کب آیا اور کب گیا تھا فیاض احمد اس میں الجھ سا گیا تھا۔

”یہ تو اچھا آئیڈیا ہے۔ اس سے ہم یہ منگنی روک سکیں گے اور بڑے اطمینان سے سوچ سکیں گے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے۔“ فیاض احمد نے سب سے پہلے کہا۔ ”نگہت بیگم اب تمہاری فکر دور ہو جائے گی۔“

”تم نے یہ سب کچھ پہلے سے سوچا ہوا تھا۔؟“ کا شان نے سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”جو بھی ہوا ہے راتوں رات ہوا ہے۔“ عاشر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔  
 ”اچھا ہے... بہت اچھا ہے۔“ اولیس نے بھی اثبات میں سر ہلا کر کہا۔  
 ”تم کیا کہتی ہو نگہت۔؟“ فیاض احمد نے نگہت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
 نگہت بیگم نے پہلے عاشر کی طرف دیکھا اور پھر فیاض احمد کی طرف اپنی نگاہیں گھما کر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ لیکن دو دن سے زیادہ میں نہیں دوں گی۔“

”ہاں.... ہو جائے گا۔“ فیاض احمد نے کہا۔  
 ”ہو جائے گا نہیں.... ہونا چاہئے۔“ نگہت بیگم نے زور دے کر کہا۔  
 ”ہوگا کیوں نہیں ہوگا۔“ فیاض احمد نے بھی زور دے کر کہا۔

”میں عظیم بھائی سے خود بات کر لوں گی۔“ نگہت بیگم نے کہا۔ اس کے لہجے سے لگتا تھا جیسے وہ بیمار ہے۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ جیسے مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اور اب چند دن چیخ پکار کے بغیر گزر جائیں گے۔ اس کے بعد ناشتہ لگانے کے لیے نوکر کو کہا گیا۔ منابل نے نگہت بیگم کی طرف جھک کر اس کے کان میں کہا۔

”ماما آپ فرح سے یہ تو پوچھیں اس کا تعلق کس فیملی سے ہے۔“

عاشر نے منابل کو کچھ کہتے دیکھا اور سوچا کہ اب وہ تیار ہو جائے کوئی ایسا تیر اس کی طرف آنے والا ہے جس کی کمان منابل بھابی کے ہاتھ میں ہے۔ نگہت بیگم نے منابل کی



”مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تم کچھ جاننا چاہتی ہو تو بات کر لو۔“ نگہت بیگم نے کہا اور چپ ہو کر بیٹھ گئی۔

سینا بھی مناہل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے مناہل وہ ہی پوچھنا چاہتی ہے جو وہ جاننا چاہتی ہے۔ مناہل نے پوچھا۔ ”فرح... تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں؟“

”میرے ابو نہیں ہیں۔ اور نہ ہی میری امی ہیں۔ وہ ایک حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔“ فرح نے جواب دیا۔ عاشر نے اسے اپنے ہارے میں سچ بولنے کے لیے ہی کہا تھا۔

”کوئی بھائی... بہن...؟“ مناہل نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں یتیم لڑکی ہوں۔ میرا کوئی بھی نہیں ہے۔“ فرح نے اعتماد سے جواب دیا۔ فیاض احمد نے شفقت سے فرح کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے برابر میں عاشر چپ بیٹھا تھا۔ اس بات کو سن کر پہلی بار نگہت بیگم نے فرح کی طرف اپنی گردن کھڑی کر کے دیکھا تھا۔

”میں مزید بتا دیتا ہوں۔ یہ اس دنیا میں اکیلی رہتی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”نہیں میری دادی اماں زندہ ہیں۔ اور وہ ایک گاؤں میں رہتی ہیں۔“ فرح نے فوراً کہا۔ ”اس شہر میں میں اکیلی رہتی ہوں۔“ فرح کی صاف گوئی سے سب چونک گئے تھے۔ عاشر اور فیاض احمد نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔

”اس شہر میں تم اکیلی رہتی تھی اب نہیں ہو۔“ عاشر نے فرح کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر بولا۔ ”یہ ایک کمپنی میں جاب کرتی تھی۔ ہم ملے اور پھر... سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔“ عاشر نے اختصار سے سب کچھ بیان کر دیا۔

یہ جان کر کہ فرح ایک غریب لاوارث لڑکی ہے جو ان کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی ہے، مناہل اور سینا نے تو جیسے منہ میں خار بھر لئے تھے۔ ایک معمولی لڑکی اس چھت تلے اب ان کی برابری کرے گی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نفرت سے فرح کی طرف دیکھنے لگیں۔ نگہت بیگم کے لیے بھی یہ ایک دھچکا تھا۔ اس نے عاشر کی طرف دیکھ کر طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”میں سمجھ گئی۔ عاشر تمہاری سادگی کا اس لڑکی نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ اب یہ ہمارے

ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے والی ہے۔ ذرے کو تم نے آسمان پر سجاد دیا ہے۔ اپنی بے وقوفی سے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے ماما۔ میں نے اسے اس کام کے لیے بڑی مشکل سے راضی کیا تھا۔“ عاشر نے کہا۔

”کام کیلئے۔؟“ نگہت بیگم نے فوراً الفاظ پکڑ لئے۔ فیاض احمد بھی چونکا۔

عاشر گڑ بڑا گیا اور بولا۔ ”میرا مطلب ہے کہ اپنے ساتھ نکاح کیلئے۔ کیونکہ یہ میری پسند تھی۔“

”ہمیں تو منگنی کی رسم آگے کرنے کے لیے کسی بہانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے خواہ مخواہ اس بات کو سیریس لے لیا۔“ نگہت بیگم کے چہرے پر پہلی بار ایک ایسی مسکراہٹ آئی تھی کہ عاشر کے ساتھ ساتھ فیاض احمد بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اب اس کی آواز میں کوئی نقاہت عیاں نہیں تھی۔

”تم کیا کہنا چاہتی ہو نگہت۔؟“ فیاض احمد نے فوراً پوچھ لیا۔

نگہت بیگم نے عاشر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”عاشر تم سے جو بھی ہوا، میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ اب تم ایسا کرو کہ اس کی اوقات سے بڑھ کر... نہیں تم نہیں بلکہ میں ایسا کرتی ہوں کہ جو اس کی اوقات ہے اس سے بڑھ کر اسے اتنے روپے دے دیتی ہوں کہ تم سے دور ہونے کے لیے کافی ہوں گے۔“

اس بات کو سن کر فرح نے چونک کر نگہت بیگم کی طرف دیکھا۔ اپنی اوقات کا سن کر اسے غصہ آ گیا تھا۔ وہ کچھ بھی کہہ دینا چاہتی تھی۔ لیکن وہ چپ رہی اور اپنے غصے کو زہر کی طرح گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ کیونکہ عاشر نے اسے کچھ بھی بولنے سے منع کیا تھا۔

”ماما۔ یہ میری پسند ہے۔ اب یہ لاوارث نہیں ہے۔ عاشر نے نرمی سے کہا۔

”بچوں والی بات مت کرو۔“ نگہت بیگم نے کہا اور فرح سے مخاطب ہوئی۔ ”تم بولو کتنے روپے لینے ہیں تم نے بول دو اتنے بول دو کبھی تمہارے خیال میں نہ آئے ہوں۔ میں تمہیں ابھی دوں گی۔ میرے پاس اپنا ذاتی میرے باپ کا اور میرا اپنا کمایا ہوا روپیہ بہت ہے۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے نگہت بیگم کا تکبر مرغے کی کھنٹی کی طرح ایسا ادھ تھا۔ اپنی اوقات

بتاؤ۔“ فیاض احمد کو یہ بات بہت ناگوار گزری تھی جس کا اظہار اس کے چہرے سے عیاں تھا۔  
”مما پلیز....“ عاشر نے مداخلت کی۔

”تم چپ رہو۔“ نگہت بیگم کی نگاہیں فرح کے چہرے پر تھیں اور اس نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے عاشر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا اور فرح سے بولی۔ ”ہاں تم بولو۔“  
”میری اوقات آپ کی دولت کا انبار نہیں ہے۔“ فرح نے شائستہ لہجے میں ایک نظر نگہت بیگم کی طرف دیکھا اور بولی۔

”مما آپ چاہتی ہیں کہ ہم یہاں سے اٹھ جائیں۔؟“ عاشر نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ نگہت بیگم کچھ اور کہتی فون کی گھنٹی بول پڑی۔ سب کی خاموشی میں فون کی گھنٹی کی آواز گونج رہی تھی۔ عاشر نے فون کی طرف دیکھا۔ فون کا ایک سیٹ دائیں طرف تھا جبکہ اس سے منسلک دوسرا سیٹ عاشر سے کچھ فاصلے پر نگہت بیگم کے عقب میں تپائی پر پڑا تھا۔ عاشر جو نہی فون کی طرف بڑھا اسی اثنا میں سبینا بھی اٹھ کر فون کے پاس چلی گئی تھی۔ عاشر کا ہاتھ فون کی طرف بڑھا ہی رہ گیا تھا کہ سبینا نے فون اٹھا کر ہیلو بھی کہہ دیا تھا۔

”کیسی ہو صبا....“ جو نہی سبینا نے صبا کا نام لیا سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ”ہاں.. ہاں...مما ہے۔ میں بات کراتی ہوں۔“ سبینا نے کہا اور فون نگہت بیگم کی طرف بڑھا دیا۔ جیسے ہی نگہت بیگم نے ریسور کان سے لگایا ٹھیک اسی اثنا میں عاشر نے اس سے منسلک فون کا ریسور اٹھا کر اپنے کان سے لگا لیا تھا۔ نگہت بیگم کے علاوہ سب نے عاشر کی یہ حرکت دیکھی تھی۔

”کیا بات ہے صبا آج اتنی صبح فون کر دیا۔ خیریت تو ہے۔“ نگہت بیگم نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں خیریت ہے آنٹی... ایک بات کرنی تھی۔“ صبا کی آواز آئی۔

”ہاں بولو کیا بات ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”یہ بات میں آپ سے کر رہی ہوں۔ پلیز پپا سے آپ خود کر لیجئے گا۔“ صبا نے کہا۔

”بات کیا ہے۔“ نگہت نے مسکرا کر پوچھا۔ اس کی دانست میں تھا کہ صبا کوئی ایسی

فرمائش کرنے والی ہے جو اس کا باپ اس کے کہنے پر ہی پوری کرے گا۔ یہ سوچ کر ہی نگہت بیگم

کے چہرے کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی۔

”آج میری اور عاشر کی منگنی ہے۔ آنٹی میں ابھی منگنی نہیں کروں گی۔ پپا سے کہہ کر آپ

اسے ملتوی کر دیجئے۔“ صبا نے اچانک کہا۔

”لیکن کیوں۔؟“ نگہت بیگم چونک کر بولی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اس کیوں کا ابھی میں جواب نہیں دے سکتی۔ میں یہ بات خود پپا سے کہہ دیتی۔ لیکن

آپ کو اس لئے بتا رہی ہوں کہ آپ مجھ سے پپا جتنے سوال نہیں پوچھیں گی۔ میں پپا سے دو تین

گھنٹوں کے بعد ملوں گی۔ او کے خدا حافظ۔“ صبا نے کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

نگہت بیگم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ حیرت اس کے چہرے سے عیاں ہو گئی

تھی۔ وہ دم بخود تھی کہ اسے اپنے کان سے ریسور الگ کرنے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ سب ہی

نگہت بیگم کا چہرہ دیکھ رہے تھے کہ اس نے ایسا کیا سن لیا ہے کہ وہ دم بخود رہ گئی ہے۔ فرح کی

نگاہیں کبھی نگہت بیگم کی طرف جاتی تھیں اور کبھی عاشر کی طرف۔ اور عاشر تھا کہ غیر متوقع بات

سن کر ایک دلفریب اور متحیر مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے ہوئے تھا۔



سے قبل جو سامان اس نے یہاں سے اٹھایا تھا وہ اب بھی اسی طرح اپنی جگہ پر ہے۔  
آفتاب نے اس گھر کا ایک ایک کمرہ دیکھ لیا تھا اس کی دیواروں کا چھوٹا تھا۔ اپنی نم ہوئی  
آنکھوں کو صاف کیا اور اس کمرے کے فرش پر ہی بیٹھ گیا جو اس کی ماں کا کمرہ تھا۔ بشیر جیلانی کو  
اس نے کمرے سے باہر ہی رکنے کے لیے کہا تھا۔

جب آفتاب کو اپنے اچھے خاصے کاروبار میں اچانک نقصان ہونا شروع ہوا تھا تو دیکھتے  
ہی دیکھتے اس کے ہاتھ سے سب کچھ نکل گیا تھا۔ اپنے چھوٹے سے آبائی شہر سے نکل کر آفتاب  
نے یہ گھر بڑے شوق سے خریدا تھا۔ اس گھر میں اس کی ماں ایک چھوٹا بھائی اور بہن رہائش  
پذیر ہوئی تھی۔ بہن کی شادی کے بعد وہ تین ہی اس گھر میں رہ گئے تھے۔ جب قرض کا بوجھ  
بہت زیادہ ہو گیا تو مجبوراً اسے یہ گھر بھی بیچنا پڑا تھا۔

اب جیسے ہی اس نے دن رات ایک کر کے پیسہ کمایا تو بشیر جیلانی کو جو اس نے پہلی  
ہدایت کی تھی وہ یہ تھی کہ کسی بھی قیمت پر اسے وہی گھر خریدنا ہے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ گھر کچھ ماہ  
سے خالی تھا اور اس کا مالک مکان بیچنا چاہتا تھا۔ بشیر جیلانی کو یہ گھر خریدنے کے لیے کچھ زیادہ  
تنگ دود نہیں کرنی پڑی تھی۔ آفتاب اس گھر میں آ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اب وہ پھر سے اس  
شہر میں اپنا کاروبار شروع کرنے والا تھا۔

جب سورج کی پہلی کرن نے زمین پر اپنا قدم رکھا تو آفتاب نے کچھ ہدایات کر کے بشیر  
جیلانی کو بھیج دیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور بشیر جیلانی نے جو نمبر اسے صبا کا دیا تھا وہ  
پیش کیا اور تیل جانے تک وہ انتظار کرنے لگا۔ کئی تیل جانے کے بعد خمار میں ڈوبی صبا کی آواز  
ابھری۔ ”ہیلو۔“

”صبا.... میں آفتاب بول رہا ہوں۔“ آفتاب نے کہا۔

جونہی وہ جملہ اس کے کان میں پڑا، یکدم صبا کی نیند کا خمار کا فور ہو گیا تھا اور وہ بستر میں  
سیدھی ہوتی ہوئی خوشگوار حیرت کے ساتھ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ ”آفتاب تم.... کہاں سے  
بول رہے ہو۔؟“

”تمہارے شہر سے....“ آفتاب نے جواب دیا۔

.....

رات کا پہر تھا جب ہوائی جہاز نے اپنے پیسے زمین سے لگائے تھے۔

آفتاب ہاتھ میں ایک بریف کیس پکڑے اس ہوائی جہاز سے باہر نکلا تھا۔ وہ  
خوبصورت اور خوش لباس تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طمانیت تھی۔ جب وہ ایئر پورٹ سے  
باہر نکلا تو ایک سیاہ کار کے ساتھ بشیر جیلانی لگ کر کھڑا تھا۔ وہ آفتاب کو دیکھتے ہی مسکرا کر اس  
کی طرف بڑھا، دونوں بغل گیر ہوئے اور بشیر جیلانی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ جبکہ  
آفتاب اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے  
ہوئے جا رہے تھے۔

بشیر جیلانی نے جب کار ایک خوبصورت گھر کے سامنے کھڑی کی تو کار سے باہر نکلنے سے  
پہلے ہی آفتاب نے اپنی نگاہیں اس گھر کے بیرونی حصے پر مرکوز کر دی تھیں، وہ اس گھر کو دیکھتے  
ہوئے ہی باہر نکلا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی لگتا تھا جیسے اس کی پلکیں بھیگ گئی  
ہیں۔ بشیر جیلانی نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا، آفتاب کھوئے ہوئے انداز میں چلتا  
ہوا اندر چلا گیا تھا۔ وہ دائیں بائیں اپنی نگاہیں ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح چلتا ہوا  
مین دروازے کے پاس چلا گیا۔ پہلے اس نے اس دروازے کو چھو کر دیکھا، اسی دوران بشیر  
جیلانی اس دروازے کا بھی قفل کھول چکا تھا۔ آفتاب دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ ہر طرح کے  
سامان سے عاری وہ ٹی وی الاؤنچ تھا۔ لیکن آفتاب کو لگ رہا تھا جیسے اس گھر کو فروخت کرنے

”کہاں ہو۔؟“ صبا نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”اپنے گھر میں۔“ آفتاب نے کہا۔

”کونسا گھر.....؟“ صبا نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ”تمہارا تو اس شہر میں ایک ہی گھر تھا اور وہ تم

نے بیچ دیا تھا۔“

”اب وہ پھر سے میرا ہو گیا ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

”میں آ رہی ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔“ صبا نے کہا اور آفتاب کی بات کا انتظار کئے

بغیر وہ اپنے بستر سے نکلی اور جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اس کے اندر ایک بجلی سی بھڑکی تھی

اور آفتاب کے آنے کی خوشی میں اس کی نیند جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس نے آنا فانا منہ

ہاتھ دھویا، کپڑے تبدیل کئے اپنا موبائل فون اور کار کی چابی پکڑی اور بھاگنے کے انداز میں

اپنے کمرے سے باہر نکل گئی۔

جب صبا اسی گھر میں پہنچی جو آفتاب نے پھر سے خرید لیا تھا تو اسے اپنے سامنے آفتاب کو

ایک طویل عرصے کے بعد دیکھ کر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھے

جار ہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ ایک دوسرے سے ملنے کی مسرت تھی۔ صبا

نے شکوہ کے انداز میں کہا۔ ”تم اچانک چلے گئے اور مجھے پرایا سمجھ کر کچھ بتایا ہی نہیں۔ کیا میں

تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ تم مجھے ایک بار کہتے تو سہی۔ جدائی کے یہ پل ہمارے بیچ آتے

ہی نہیں۔“

”میرے ابو نے مجھے ایک بات یہ بھی سیکھائی ہے کہ جسم میں ہمت ہے تو پہاڑ کھود کر اپنا

راستہ بنا لو۔ ہاتھ وہ پھیلاتے ہیں جو کمزور ہوں اور کچھ کرنا نہ چاہتے ہوں۔ میں کمزور نہیں

تھا اور نہیں ہوں۔ میں نے کسی سے مدد نہیں مانگی۔ سو اے اس خدا سے جو مددگار ہے۔ وہی خدا

ہے جو مدد کرتا ہے۔“ آفتاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم مجھ سے کچھ کہتے.... یوں اچانک خاموشی سے چلے جانا..... اور....“ صبا نے پھر

کچھ کہنا چاہا۔

”صبا.... بھول جاؤ ہر وہ بات جو ماضی میں ہوئی.... میں چلا گیا۔ تم سے کچھ نہیں

کہا.... وغیرہ وغیرہ.... اور ایک بات یاد رکھو کہ میں آ گیا ہوں۔“ آفتاب نے اس کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”او کے....“ صبا نے کہا۔ ”اب کوئی پرانی بات نہیں کروں گی۔ یہ بتاؤ تم کب آئے۔؟“

”چند گھنٹے پہلے.... اور سب سے پہلے تم سے ملاقات کر رہا ہوں۔“ آفتاب نے مسکرا کر

کہا۔

”آج کا دن میری زندگی میں ایک خوبصورت ترین دن ہے۔“ صبا خوش ہو کر

بولی۔ ”جس کا اظہار کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی

ہوں۔“

”صبا میں نے یہ گھر خرید لیا ہے۔ اب میں اپنے کاروبار کا آغاز تمہارے ساتھ مل کر کرنا

چاہتا ہوں۔ وقت ضائع کرنے کی بجائے اسے اپنی گرفت میں کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے نئے

برنس کا آغاز کرنے سے پہلے.... تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ آفتاب نے اس کے چہرے

پر اپنی نگاہیں مرکوز کئے کہا۔

صبا نے اس کی بات سنی اور چہرے سے خوشی کا ایسا اظہار مترشح ہونے لگا کہ جیسے اس سے

یہ خوشی برداشت نہیں ہوگی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ وہی الفاظ سن رہی ہے

جو ابھی آفتاب نے اُسے کہے ہیں۔

”آفتاب اب میں بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ ہم مل کر کام کریں گے۔ برنس بڑھائیں

گے۔“ صبا نے کہا۔

”تو کب ملواری ہو تم مجھے اپنے پیار سے۔؟“ آفتاب نے پوچھا۔

”آج.... ابھی....“ صبا نے گرمجوشی سے کہا۔

”آج تین بجے۔؟“ آفتاب نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ ہم پیار کے آفس میں مل لیں گے۔“ صبا نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے ہم تین بجے ملتے ہیں۔“ آفتاب نے کہا۔ وہ بھی خوش ہو گیا تھا۔ خالی گھر

میں دونوں کی بولنے کی بازگشت بھی گونج رہی تھی۔



دھڑکن

جب صبا اس گھر سے باہر نکلی تو اس نے اپنی گاڑی کچھ آگے لے جا کر روکی اور عاشر کے گھر کا نمبر ملا کر نگہت بیگم سے بات کی اور اطمینان سے فون بند کر کے اپنے گھر چلی گئی۔ صبا نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کیا، موبائل و ابھریشن پر لگایا اور اپنے بستر پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئی۔ اس کے اندر کی خوشی ابھی تک اس کے چہرے سے مترشح تھی اور وہ بار بار مسکرا رہی تھی۔ نگہت بیگم کو فون اس نے اس لئے کیا تھا تاکہ جب تک وہ اپنے کمرے سے باہر نکلے گی تب تک یہ بات دونوں خاندانوں میں پھیل چکی ہوگی۔ کسی ناخوشگوار بات کو سن کر جو اچانک رد عمل ہوتا ہے کچھ وقت گزرنے کے بعد اس میں تغیر آ جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے پاپا کو یہ بات بتاتی تو پھر جو اس کی طرف سوالوں کی بوچھاڑ پاپا کی طرف سے ہوتی، جس طرح سے نگہت بیگم سے بات کر کے اس نے فون بند کر دیا تھا اس طرح سے وہ پاپا سے مختصر بات کر کے فون بند نہیں کر سکتی تھی۔ اُسے فون پر ہی کئی سوالوں کے جواب دینے پڑ جاتے۔ اب وہ پرسکون تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور آفتاب کے سپنے دیکھنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

نگہت بیگم کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر فیاض احمد نے بار بار پوچھا تھا تو اس نے زبان کھول کر گول مول الفاظ میں جو صبا نے کہا تھا وہ بتا دیا تھا۔ یہ سن کر سب اپنی اپنی جگہ سس شد رہ گئے تھے۔ فرح نے سکون کی سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا تھا 'چلو جان بھئی'۔ عاشر نے آگے بڑھ کر کہا۔

”اتفاق سے میں نے بھی ادھر سے فون کا ریسیور اُٹھالیا تھا۔ صبا نے بات کچھ اس طرح سے کی تھی۔“ اس کے بعد عاشر نے لفظ باللفظ وہ بات دہرا دی جو صبا نے کہی تھی۔ نگہت بیگم یہ جان کر کہ عاشر نے ساری بات سنی ہے اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ عاشر چپ ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ نگہت بیگم اب اسے کچھ نہ کچھ ضرور کہے گی لیکن غیر متوقع طور پر نگہت بیگم چپ رہی اور اس نے اپنی نگاہیں عاشر کے چہرے سے ہٹا لی تھیں۔ شاید صبا نے اسے بولنے کے قابل چھوڑا نہیں تھا۔

دھڑکن

”صبا نے ایسا کیوں کیا؟“ منابل نے حیرت کے اس غلاف کو ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے سب ہی چپ تھے۔

نگہت بیگم اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ ”میں عظیم بھائی کے پاس جا رہی ہوں۔“

”میں بھی چلتا ہوں۔“ فیاض احمد بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اکیلی ہی جاؤں گی۔“ نگہت بیگم نے کہا۔ اس کا خیال تھا جو بھی وہاں بات ہوگی وہ ساری کی ساری فیاض احمد کو پتہ نہ چلے اور وہ تہدیلی کے ساتھ ان کے سامنے بیان کرنے میں آسانی محسوس کرے گی۔

”ڈیڈ کو ساتھ جانا چاہئے۔ کیوں اولیس بھائی؟“ عاشر نے کہہ کر اولیس کی طرف دیکھا۔

”عاشر کا خیال ٹھیک ہے۔ ڈیڈ کو بھی جانا چاہئے۔“ اولیس نے اس کی تائید کی۔

”لیکن ہمیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟“ کا شان نے اچانک کہا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”ہم تو پہلے ہی ایک بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ صبا کے منع کرنے پر ہمیں کوئی بہانہ نہیں کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم ماموں سے بعد میں بھی اطمینان سے مل سکتے ہیں۔“

”بات کا شان کی بھی ٹھیک ہے۔“ فیاض احمد نے جلدی سے اپنی گردن اثبات میں ہلائی۔

”اسی لئے تو جا رہی ہوں تاکہ میں اُلٹا وہاں جا کر ان سے پوچھوں کہ صبا ایسا کیوں کر رہی ہے۔ ہمارے سارے انتظامات ہو چکے ہیں۔“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور اگر ماموں نے صبا کو منالیا تو پھر آپ کیا کریں گی؟ جبکہ ہم تو خود منگنی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“ اولیس نے کہا۔ ”پھر آپ کیا جواب دیں گی۔ عاشر کو منالیں گی جبکہ وہ تو اب دوسری شادی کرنے سے رہا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ عظیم سے بات ضرور کرے لیکن اسے مجبور نہ کرے۔“ فیاض احمد نے تجویز دی۔ ”وہ پنجابی کی ایک کہادت ہے جو میں اردو میں کہتا ہوں کہ شالیم سے مٹی جھاڑنے

کے لیے جاؤ بس۔“

”ہاں.... ایسا ہو سکتا ہے۔“ منابل نے کہا۔

”میں بہتر جانتی ہوں کی مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ میں جارہی ہوں۔“ نگہت بیگم نے خشک لہجے میں کہا۔

”میں بھی آ رہا ہوں۔“ فیاض احمد نے کہا اور پیچھے چل پڑا۔ عاشر نے ایک قہقہہ فضا میں چھوڑا اور پرسکون ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

نگہت بیگم اور فیاض احمد جب صبا کے گھر پہنچے تو اس وقت عظیم کمال اپنے آفس جانے کے لیے گیراج میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ اچانک ان کی گاڑی دیکھ کر وہ رک گیا۔ نگہت بیگم نے باہر نکل کر پہلے سلام کیا اور پھر کہا۔ ”آپ جا رہے ہیں۔“

”ہاں آفس کے لئے نکل رہا تھا۔ خیریت ہے۔؟“ عظیم کمال نے پہلے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”ہاں کچھ بات کرتی تھی۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

عظیم کمال نے ایک بار پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر انہیں اندر لے کر چلا گیا۔ صبا کی ماں عذرا کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ اس کے بعد جو اسے صبا نے کہا تھا وہ من و عن بتا دیا جسے سن کر عظیم کمال کے ساتھ عذرا بھی حیران ہوئی تھی۔ جب نگہت بیگم نے اپنی بات مکمل کر لی تو عظیم کمال نے فوراً پوچھا۔

”یہ بات اس نے مجھ سے یا اپنی ماما سے کرنے کی بجائے تم سے کیوں کی۔؟“

”یہ بات آپ صبا کو بلا کر پوچھیں۔ اور میں یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ صبا ایسا کیوں چاہتی ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”صبا اس وقت اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔“ عذرا نے کہا۔ گھر میں کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ صبا صبح سویرے اُٹھ کر کہیں گئی تھی اور واپس آ کر وہ اپنے کمرے میں پھر سے بند ہو گئی ہے۔

”بھابی آپ اُسے چگائیں۔“ نگہت بیگم نے زور دینے کے انداز میں کہا۔

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس نے آپ سے بات کس وقت کر لی وہ تو لیٹ اُٹھنے

کی عادی ہے۔“ عذرا نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ اس وقت اپنے کمرے میں جاگ رہی ہوگی۔“ نگہت بیگم نے کہا۔ ”ہماری ساری

تیار ہو چکی ہے۔ رات کو فنکشن ہے اور صبا نے یہ فون کال کر دی۔ ہم اس کی کال سن کر پریشان ہو گئے ہیں۔“

عذرا نے ایک نگاہ عظیم کمال کی طرف دیکھا اور ملازمہ کو آواز دے کر کہا وہ صبا کے کمرے کے دروازے پر دستک دے۔ اور اگر وہ جاگ رہی ہے تو ابھی نیچے آ جائے۔ ملازمہ چلی گئی۔ جب کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس نے بتایا۔

”صبا بی بی نے اندر سے دروازہ نہیں کھولا ہے۔ میں نے بار بار دستک دی تھی۔“

”میں جاتی ہوں۔“ نگہت بیگم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”نگہت..... ابھی عظیم کو بھی جلدی ہے۔ کچھ دیر بعد صبا اُٹھ ہی جائے گی۔ میں اطمینان

سے اس سے بات کروں گی اور تمہیں فون کروں گی۔“ عذرا نے اس کی طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا کہ نگہت بیگم اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔

”ہاں عذرا اٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ بات پھر بھی کر لیں گے۔ میری ایک ضروری میٹنگ

بھی ہے۔“ عظیم کمال نے ایک بار اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لیکن بھائی.....“ نگہت بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

”ڈونٹ وری نگہت.... صبا سے عذرا پوچھ لے گی۔ جو بات ہوگی وہ تمہیں بتا دے

گی۔ منگنی اگر آگے پیچھے بھی ہو جائیگی تو کیا ہو جائے گا۔“ عظیم کمال نے کہا اور اُٹھ کر اجازت لے کر چلا گیا۔

”نگہت..... میں تمہیں فون کر دوں گی۔“ عذرا نے اُٹھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ نگہت بیگم کا تن بدن غصے سے بھر گیا تھا۔ یہاں اسے عاشر کی ایک بات یاد آ گئی تھی جو اسے

فیاض احمد نے ایک بار بتائی تھی کہ صبا اور اس کی فیملی کو عاشر کیوں پسند نہیں کرتا ہے اس فیملی میں

دھڑکن

اپنی مرضی، گھمنڈ اور کسی کی بات کو کوئی اہمیت نہ دینا، کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اسی خاندان سے تھی۔ اسی بھائی کی بہن تھی۔ ایسی ہی عادات اس میں بھی تھیں، لیکن اسے اپنے اندر ایسی بات کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ آج اُسے ان باتوں کا سامنا کرنا پڑا تو ان کی برائی سامنے آ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبا کو پتہ تھا کہ نگہت بیگم اور فیاض احمد کب آئے تھے اور ان چاروں کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی کھڑکی سے ہی دیکھ لیا تھا۔ جب ملازمہ اُسے بلانے کے لیے گئی تھی تو اس وقت صبا دروازے کے ساتھ ہی لگ کر کھڑی تھی۔ ملازمہ کو اس نے جیسا کہا تھا دیا ہی اس نے اندر جا کر بول دیا تھا۔ اس کے لیے یہ بات اچھی تھی کہ اس کے پاپا اور ممانے اس کی بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ وہ آسانی سے اپنی بات کر سکتی تھی۔

دن دو بجے جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تو وہ تیار تھی۔ تین بجے اسے آفتاب کے پاس جانا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ دیر اسے اپنی ماما کے پاس بھی لگے گی۔ عذرا اس وقت خود کہیں جانے کی تیاری میں تھی کہ اس کی نگاہ صبا پر پڑی۔ اس نے صبا کو اپنے پاس بلا لیا۔

”تم نے نگہت کو فون کیا تھا؟“ عذرا نے پوچھا۔

”ہاں ماما کیا تھا۔“ صبا نے جواب دیا۔

”لیکن کیوں؟“ عذرا نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

صبا نے عذرا کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”ماما.... آفتاب آ گیا ہے۔“

”آفتاب آ گیا ہے....؟ اچانک....؟“ عذرا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ آفتاب اور اس سے جو صبا کا تعلق تھا، اُس نے اپنی ماما اور پاپا سے مخفی نہیں رکھا تھا۔ اس کے اچانک چلے جانے سے ان باتوں اور تعلق پر گرد پڑ گئی تھی۔ ”لیکن آ گیا ہے تو پھر....؟“

”پھر یہ کہ میں عاشر سے منگنی نہیں کروں گی۔“ صبا نے صاف الفاظ میں کہا۔

”تم نے آفتاب کے لیے انکار کیا تھا؟“ عذرا نے پوچھا۔

دھڑکن

”میری اس سے بات ہو چکی ہے۔ وہ آج رات ہی سڈنی سے آیا ہے۔ بہت روپیہ کما کر لایا ہے۔ وہ پھر سے اس شہر میں بزنس کرنا چاہتا ہے۔ اس شہر میں آتے ہی وہ مجھ سے سب سے پہلے ملا اور اب ہم جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ صبا نے بلاتال کہا۔

”صبا یہ کھیل نہیں ہے جو تم کھیل رہی ہو۔ کبھی اس لڑکے کو اپنا نا چاہتی ہو اور کبھی عاشر پر تمہاری نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔“ عذرا نے اسے سمجھانے کی انداز میں کہا۔ ”زندگی کا سب سے سنجیدہ ترین کام ہے یہ۔“

”جب کسی کے اندر کوئی بے چینی ہو، کسی کا انتظار ہو تب وہ کبھی ادھر ٹھہرتا ہے اور کبھی ادھر.... بے چینی ختم ہو جائے اور کسی کا انتظار بھی نہ رہے تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سکون آ جاتا ہے۔ اب آفتاب آ گیا ہے اور کوئی نہیں ہے۔ تین بجے میں آفتاب کو اپنے ساتھ لے کر پاپا کے آفس میں جا رہی ہوں۔ میرے جانے سے پہلے آپ پاپا سے ساری بات کر لیں۔ مجھے وہاں جا کر کوئی بات نہ کرنی پڑے۔ ان کو پتہ ہو کہ میں اور آفتاب کیوں ان کے پاس آئے ہیں۔“ صبا نے عذرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور عاشر کے ساتھ جو آج منگنی ہو رہی تھی وہ؟“ عذرا نے کہا۔ ”خاندان میں باتیں ہونگی۔“

”باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان سے کیا ڈرنا۔“ صبا نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ ”مجھے آفتاب سے ہی شادی کرنی ہے۔“

عذرا چپ ہو کر سوچنے لگی۔ آفتاب اچھا لڑکا تھا۔ پہلے بھی عظیم کمال اور اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اور پھر صبا کی پسند ان کی پسند پر ہمیشہ غالب رہی ہے۔ وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں بات کر لوں گی۔“

صبا نے اپنی ماں کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر الگ ہو کر کہا۔ ”ماما کل اچانک مجھے ایک خیال آ گیا تھا۔ ایسے ہی حالانکہ میں نے وہاں سے گزرتے ہوئے محض اس طرف دیکھا ہی تھا۔“

”کیا خیال آ گیا تھا اور کیا دیکھا تھا؟“ عذرا نے پوچھا۔

دھڑکن

”نگہت آنٹی کا جو شوروم ہے۔ اس کے ساتھ والی جگہ تو آپ کی تھی، جو نگہت آنٹی نے آپ سے یہ کہہ کر لے لی تھی وہ اس کی ادائیگی کرے گی۔ اور پھر ساری جگہ ملا کر اس پر اپنا وسیع شوروم بنالیا تھا۔“ صبا نے مشاق انداز میں کہا۔

”ہاں ایسا ہی تھا۔“ عذرا نے ڈھیلے انداز میں کہا۔

”دادا ابونے پپا سے کہا تھا وہ جگہ میں نے نگہت کو گفٹ کی ہے تم بھی عذرا سے کہو کہ وہ اس جگہ کی قیمت نگہت سے نہ لے۔ اس کے بدلے میں میں اور جگہ دے دوں گا، اور ابھی تک آپ کو اس کے بدلے میں جگہ نہیں ملی۔ پپا کے کہنے پر آپ چپ ہو گئی تھیں۔ اب لاکھوں روپیہ اس جگہ سے آنٹی نگہت کماتی ہیں۔ جبکہ اس جگہ کا ایک حصہ آپ نے اپنے پیسے سے لیا تھا۔ فائدہ آنٹی اٹھا رہی ہیں۔“ صبا نے کہا۔ ”آپ کے حصے کی وہ جگہ کروڑوں روپے کی ہے۔“

”یہ بات میرے دل میں کئی بار آچکی ہے۔ تمہارے رشتے کی بات چلی تو پھر چپ ہو گئی۔ اب میں کیا کر سکتی ہوں۔“ عذرا نے تاسف سے کہا۔ ”جبکہ نگہت کے لیے وہ ساری جگہ سونے کی کان بنی ہوئی ہے۔“

”آپ اپنے وکیل سے مشورہ کر کے کیس کر دیں۔ وہ جگہ آپ کے نام ہے۔“ صبا نے کہا۔

”تمہارے پپا اور دادا بیچ میں آجائیں گے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ عذرا نے کہا۔

”آپ وکیل انکل سے بات تو کریں۔ ان کے پاس بہت راستے ہوتے ہیں۔ کسی اور کو

کھڑا کر دیں۔ اور کہیں کہ میں نے تو وہ جگہ بیچ بھی دی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔“ صبا نے ایک نئی تحریک دے دی تھی۔ نندہ ہونے کے ناطے وہ پہلے ہی کچھ نگہت بیگم سے خار کھاتی تھی۔ اس نے سوچا کہ صبا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ عذرا اپنے کام سے کہیں باہر جا رہی تھی اس نے سوچا کہ وہ کہیں جانے سے قبل اپنے وکیل کے پاس پہلے جائے گی۔ صبا کی چھوڑی ہوئی چنگاری نے بڑی جلدی آگ پکڑ لی تھی۔ صبا کے جانے کے بعد عذرا نے فون کر کے ساری بات سے عظیم کمال کو آگاہ کر دیا۔

☆.....☆.....☆

دھڑکن

دروازے پر بڑے زور سے تھپ... تھپ... ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے دروازہ بجانے والا پوری قوت سے اپنا ہاتھ مار رہا ہے۔ خالہ نسرین نے جیسے ہی دروازہ کھولا، سامنے شیردل اپنے ایک آدمی کے ساتھ کھڑا تھا۔

”ارے تم... آ جاؤ آ جاؤ۔“ خالہ اسے دیکھتی ہی خوش ہو کر بولی۔

شیردل نے اپنی مونچھ کو تانا دیا اور اپنے آدمی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اسی اثنا میں خالو بھی کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ بھی اچانک شیردل کو دیکھ کر خوشگوار حیرت میں اس کی جانب بڑھا تھا۔ اوپر کے حصے میں کرائے دار منتقل ہو گئے تھے اس لئے وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔

”بڑی خوشی ہوئی ہے آپ ہمارے غریب خانے میں آئے ہیں۔ بھئی ان کے لئے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو۔“ خالو نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ شہر آیا تھا۔ سوچا یہاں سے بھی ہوتا جاؤں۔“ شیردل نے کہا۔ وہ کرسی پر اپنی ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”آپ پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو کچھ تو کھانا پینا ہوگا۔“ خالہ نے کہا۔

”مجھے جلدی ہے۔“ شیردل نے کہا اور پھر پوچھا۔ ”فرح اپنے کمرے میں ہے کیا؟“

یہ سنتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ خالو بولا۔ ”وہ تو چلی گئی۔“

”چلی گئی؟ کہاں؟“ یکدم شیردل اپنی مونچھ کو تانا دینا بھول گیا اور اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اُسے کوئی بڑی نوکری مل گئی تھی۔ رہنے کے لیے گھر بھی مل گیا ہے۔ ہم نے بہت زور

لگایا کہ ایک اکیلی لڑکی کا کہیں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن وہ مانی ہی نہیں۔ اور چلی گئی۔“ خالو نے بتایا۔

”کہاں نوکری کرتی ہے کہاں رہتی ہے؟“ شیردل نے پوچھا۔

خالہ اور خالو نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خالو نے بتایا۔ ”ہمارے بار

بار پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔“



”ہماری مانتی ہی کب تھی۔ اپنی مرضی کی مالک تھی۔“ خالہ نے کہا۔

”کچھ تو اتہ پتہ ہوگا؟“ شیردل کوتاؤ آ گیا تھا۔

دونوں گھبرا گئے۔ ”ہم کچھ نہیں جانتے۔“

”میں اُسے لینے کے لیے آیا ہوں۔“ پھر اس نے اپنے پیچھے کھڑے آدمی کو مخاطب

کیا۔ ”او... بخشو۔“

”جی چھوٹے چوہدری صاحب۔“ وہ یکدم متوجہ ہوا۔

”دیکھ سارا گھر... کسی کمرے میں تو نہیں ہے۔“ اس نے حکم دیا اور بخشو نے حکم بجالانے

میں ذرا دیر نہیں کی۔

”ہم سچ کہہ رہے ہیں فرح بغیر بتائے چلی گئی ہے۔“ خالو نے پریشان ہو کر کہا۔

”تم دونوں نے کہیں اسے آگے کچھ کر دیا ہے تو سچ سچ بتادو۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ بول

رہا ہوں میں۔“ شیردل کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

”ہمیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور ہم آپ سے جھوٹ بولیں گے۔؟“ خالو

نے کہا۔ ”ہمیں کسی بات کا علم ہی نہیں ہے۔ پھر ہم ایسا کیوں کریں۔“

اسی دوران بخشو اندر آ گیا۔ وہ اوپر تک کا حصہ دیکھ آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ فرح گھر میں

نہیں ہے۔ شیردل اپنی جگہ سے اٹھ کر سوچنے لگا۔ خالہ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”ویسے بات کیا ہے۔ تم فرح کو کیوں لے جانا چاہتے ہو۔؟“

اس کی بات سن کر شیردل نے خالہ کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔ شیردل نے کہا۔ ”واقعی

وہ بغیر بتائے چلی گئی ہے۔ اور جہاں گئی ہے تم دونوں کچھ نہیں جانتے۔“

”ہم قسم کھانے کے لیے تیار ہیں۔ اور کوئی خاص بات ہے تو ہمیں بتاؤ ہم اسے تلاش

کرنے میں مدد کریں گے بس ذرا...“ خالو نے کہتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ پر خارش کی۔

شیردل نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”خاص بات ہی ہے... ہم بھی اس کی تلاش

کرتے ہیں۔ تم بھی ڈھونڈو... تمہارا ہاتھ انعام سے بھر دوں گا۔“

شیردل چلا گیا۔ دونوں سوچنے لگے کہ فرح کو تلاش کرنے کا اس کا کیا مقصد ہے۔

☆.....☆.....☆

صبا وقت پر آفتاب کے گھر پہنچ گئی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی کہ اس گھر میں بہت سا

نیا سامان آ گیا تھا۔ فرنیچر سے ڈرائینگ روم سج گیا تھا۔ بیڈروم میں نئے بیڈ نے جگہ لے لی تھی

اور اس کے علاوہ بھی سامان آ رہا تھا۔ تزئین و آرائش کے لیے دو آدمی کام کر رہے

تھے۔ آفتاب تیار کھڑا تھا۔ صبا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم تو ہر کام بہت تیزی سے

کر رہے ہو۔؟“

”سارا کام بشیر چچا کر رہے ہیں۔“ آفتاب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آؤ چلتے ہیں۔“

دونوں کار میں بیٹھ کر عظیم کمال کے دفتر میں چلے گئے تھے جو کہ اس کے ذاتی پلازے کی

پہلی منزل پر تھا۔ راستے میں صبا نے بتا دیا تھا کہ ان کے جانے سے بھی پہلے ساری بات چیت

پہنچ چکی ہوگی۔

جب آفتاب اور صبا عظیم کمال کے کمرے میں پہنچے تو وہ اس وقت میٹنگ میں مصروف

تھا۔ کیونکہ ان کے آنے کی اطلاع پہلے ہی عظیم کمال کو مل چکی تھی اس لئے اس نے اپنے سیکرٹری

کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ جیسے ہی آئیں انہیں اس کے کمرے میں بیٹھا دیا جائے۔ عظیم کمال کا

کمرہ واقعی ایک شاہکار تھا۔ اس کمرے میں قلمدان تک سرحد پار کے کسی ملک سے خریدا ہوا

تھا۔ ان کو بیٹھے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ عظیم کمال اندر آ گیا تھا۔ وہ مسکرا کر آفتاب سے ملا

تھا۔ اور ان دونوں کے سامنے اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا تھا۔

”چائے یا کافی۔؟“ عظیم کمال نے آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ آفتاب نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔

”تم اس شہر میں آئے اپنی ذہانت سے اس شہر کے بزنس کو فتح کیا اور پھر ہاتھ جھاڑ کر

کہاں گم ہو گئے تھے۔؟“ عظیم کمال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جو میں بھول جانا چاہتا ہوں۔ اپنی تکلیفوں میں زندہ رہنے سے

بہتر ہے کہ بندہ آگے کی سوچے جو پل گزار رہا ہے اسے بہتر کرنے کی فکر کرے۔ جو گزر گیا وہ

نوجوان ہے۔ مجھے پسند ہے۔ لیکن کیا تم اپنے اس فیصلے پر سنجیدہ ہو۔؟“  
”ایک سو دس فیصد۔“ صبا نے فوراً کہا۔

”یہ بھی دیکھ لو آفتاب کی مالی حیثیت عاشر سے کم ہے۔“ عظیم کمال نے کہا۔

”لیکن آفتاب کی میرے دل میں حیثیت سب سے زیادہ ہے۔“ صبا نے بلاتامل کہا۔

عظیم کمال نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ ٹائے کے بعد پھر کہا۔ ”ہم نے تمہاری خوشی میں اپنی خوشی تلاش کی ہے۔ زندگی تم نے گزارنی ہے۔ ہم نے تم پر کوئی پابندی نہ کبھی لگائی ہے اور نہ لگانا چاہتے ہیں۔ تم سوچنا چاہو تو پھر سوچ لو۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ ابھی تمہاری سوچ سے ایک نیا باب شروع ہوگا اور پچھلا باب ہمیں بند کرنا ہوگا۔ جو باب بند ہو جائے گا پھر وہ دوبارہ کم از کم میں نہیں کھولوں گا۔“

صبا نے بلاتامل کہا۔ ”پپا..... میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ میں اپنی زندگی آفتاب کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ یہ ہی میری منزل ہے۔“

”اوکے۔“ عظیم کمال نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی صبا بھی کھڑی ہو گئی۔ دونوں واپس اسی کمرے میں آ گئے۔ آفتاب اپنے سامنے ایک انگریزی اخبار رکھے پڑھ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ صبا پھر اس کے برابر بیٹھ گئی اور عظیم کمال نے اپنی نشست سنبھال لی۔

”ایم سوری آفتاب.... تم بور تو نہیں ہوئے۔؟“ عظیم کمال نے کہا۔

”نو..... نو.....“ آفتاب نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ جب تم اچانک چلے گئے تو صبا نے تمہاری تلاش میں دن رات ایک کردی تھی۔ میں نے بھی جہاں تک ہو سکا تھا تمہارا پتہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ صبا حقیقت کی طرف مائل ہونے لگی اور مختصر یہ کہ ہم نے اس کی منگنی اس کے کزن عاشر سے طے کر دی تھی۔ آج رات کو اس کی منگنی کی تقریب تھی۔“ عظیم کمال نے اپنے ہاتھ میں پنسل پکڑ کر اسے اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ اچانک آفتاب نے انکشاف کیا۔

گزر گیا۔ وہ سیکھنے کے لیے کافی ہے۔“ آفتاب نے بڑے اعتماد سے کہا۔

عظیم کمال نے اس کی بات سنی اور زیر لب مسکرایا۔ ”مجھے تمہاری یہ ہی بات اچھی لگتی ہے۔ تم حال میں جیتے ہو۔ اور سوچ آگے رکھتے ہو۔“

”میں آپ سے کچھ آگے کی بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔“ آفتاب نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”ہاں بولو۔“ عظیم کمال نے کہا۔

”پپا کیا ممما کا فون آیا تھا۔؟؟“ آفتاب سے پہلے صبا بول پڑی۔

”ہاں آیا تھا۔“ عظیم کمال نے کہا۔

”پھر آپ جان تو گئے ہیں۔“ صبا نے کہا۔

عظیم کمال نے کچھ توقف کیا اور پھر اٹھتے ہوئے آفتاب سے بولا۔ ”ایکسکوز می.... صبا میرے ساتھ آؤ۔“

عظیم کمال صبا کو اپنے ساتھ لے کر اس کمرے سے ملحق کمرے میں چلا گیا۔ عظیم کمال نے صبا کو اپنے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا لیا اور بولا۔ ”صبا یہ تم کیا کر رہی ہو۔“

”کیا کر رہی ہوں۔؟؟“ صبا نے پوچھا۔

”تم جانتی ہو کہ تمہاری آج منگنی ہے عاشر کے ساتھ اور تم ایک بار پھر اپنے ماضی کو سامنے لے آئی ہو۔؟“ عظیم کمال نے کہا۔

”پپا.... آفتاب کبھی میرا ماضی نہیں بنا۔“

”تو پھر وہ کیا تھا جب تم نے خود عاشر سے شادی کی بات اپنی ممما سے کی تھی۔ اور تمہاری خواہش کو دیکھتے ہوئے میں نے نگہت کو ہاں کی تھی۔“ عظیم کمال نے کہا۔

”پہلی بات یہ پپا کہ میں آفتاب کو بھولی نہیں تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب اس کی کوئی اطلاع نہ ملی تو میں نے عاشر کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب جبکہ آفتاب آ گیا ہے تو وہی میری پہلی ترجیح ہے۔“ صبا نے اطمینان سے جواب دیا۔

صبا کی بات سن کر کچھ دیر کے لیے عظیم کمال چپ ہوا اور بولا۔ ”آفتاب اچھا اور ذہین



دھڑکن

پرست لگانا۔“ عظیم کمال نے بات ختم کرنا چاہی۔ کیونکہ اس کے کاروبار کی اگلی میٹنگ کا وقت شروع ہونے والا تھا۔ اور اس میٹنگ کی کامیابی پر اسے کئی لاکھ کا فائدہ بھی ہونے والا تھا۔

”لیکن بھائی جان منگنی کی تیاری ہو چکی ہے۔“

”ڈونٹ وری.... اسی ہوٹل میں اسی وقت منگنی کی تقریب ہوگی۔“ عظیم کمال نے اطمینان سے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟؟“ نگہت بیگم کو لگا جیسے عظیم کمال اس سے مذاق کر رہا تھا اور اب وہ اصل بات کی طرف آیا ہے۔ اُمید کی ایک خفیف کرن اُبھری تھی۔ وہ آگے جانے کے لیے کچھ مضطرب سی ہو گئی تھی اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔

”منگنی کی اس تقریب میں اگر کوئی تہدیلی ہوگی تو وہ عاشر کی جگہ آفتاب کی ہوگی بس۔“ عظیم کمال کے اس انکشاف پر نگہت بیگم کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا تھا۔

”صبا کی منگنی آج ہو رہی ہے اور وہ بھی آفتاب کے ساتھ۔؟؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ ہی ان دونوں کا فیصلہ ہے۔ تم سب کو دعوت ہے۔ کوئی رنجش کوئی غم دل میں نہیں رکھنا اور سب کچھ بھلا کر آ جانا۔ ہم محلوں میں رہنے والے لوگ ہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنی عزت کا مسئلہ بنا کر بگھاڑ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میں انتظار کروں گا۔“ عظیم کمال نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

نگہت بیگم دم بخود بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ جب وہ عظیم کمال کے ساتھ باتیں کر رہی تھی تو منابل نے اپنی کرسی چپکے سے نگہت بیگم کے پاس ہی کر لی تھی۔ نگہت بیگم کے موبائل فون سے عظیم کمال کی آواز اس کی سماعت تک آرہی تھی۔ اس لئے اس نے ساری بات سن لی تھی۔

”انکل یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہیں۔“ منابل نے کہا۔ ”لیکن وہ بھی کیا کریں یہ تو صبا کا فیصلہ ہے۔“

نگہت بیگم نے اپنا موبائل سامنے میز پر رکھا اور دانت پیس کر بولی۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہوا

دھڑکن

ہے.... بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ لیکن میں بھی صبا کی منگنی شادی کے پاسیدان تک نہیں جانے دوں گی۔“

اسی اثنا میں گیٹ کے باہر ایک کار آ کر رکی۔ ہارن دیا گیا۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے چھوٹی کھڑکی سے باہر دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ کار اندر آئی۔ رکتے ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور جو اس میں سے نمودار ہوا اسے دیکھ کر نگہت بیگم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

آنے والی زریں خان تھی۔

صبا نے اپنے پاپا کے آفس سے نکلتے ہی اپنے موبائل سے جو فون کال کی تھی وہ نمبر زریں خان کا تھا۔ صبا نے اپنے اور آفتاب کے بارے میں بتاتے ہوئے آج رات کو ہونے والی منگنی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ صبا نے تو خوشخبری دینے کے انداز میں بات کی تھی لیکن اس کا مقصد جو تھا وہ زریں خان کا نگہت بیگم کے ہنگلے میں آ کر حل ہو گیا تھا۔

”تم نے کہا تھا ناں کہ پہلے آ جانا۔ گپ شپ رہے گی۔“ زریں خان نے آتے ہی مسکراتے ہوئے کہا اور ایک کرسی پر براجمان ہو گئی۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ نگہت بیگم کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

نگہت بیگم مسکرائی۔ اس نے سوچا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں نہیں بتاؤں گی تو صبا کی طرف سے پتہ چل جائے گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے صبا کی طرف سے پتہ چل بھی گیا ہو۔

”منابل تم اندر جا کر ملازم کے ہاتھ گرم چائے بھجواؤ۔“ نگہت بیگم نے منابل سے کہا۔ ”جی اچھا۔“ منابل اس جگہ سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ نگہت بیگم کے کہنے پر وہ اٹھ کر چلی گئی۔

”کوئی کام ہو تو مجھے بتاؤ۔ شادی منگنی میں مل جل کر ہی کام تو ہوتا ہے۔“ زریں خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بکو اس نہ کرو۔“ نگہت بیگم نے اُسے آہستہ سے ڈانٹ دیا۔ اس کی ڈانٹ میں اندر کی گہری دوستی عیاں تھی۔



زریر خان مسکرائی۔ ”ایم سوری.... پتہ نہیں کیوں مسکراہٹ میرے چہرے پر آ جاتی ہے۔ حالانکہ مجھے مسکرانا نہیں چاہئے۔“

”کہاں سے پتہ چلا.... اس حقیقت کا۔“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”کوئی حقیقت کا۔؟“ وہ انجان بن کر بولی۔

”یہ جو ہوا ہے اس سے یہ مطلب مت نکالنا کہ گیم اور ہو گیا ہے۔ صرف پانسہ پلٹا ہے۔ اور کچھ نہیں ہوا ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”بہر حال ہمارا آپس کا گیم ایک طرف.... لیکن ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا۔ کسی کی عزت اور وقار کا مسئلہ ہوتا ہے۔ صبا تو ایسی ہے ہی لیکن عظیم بھائی اور عذرا بھابی بھی اس کے سامنے گونگے ہو جاتے ہیں۔“ پہلی بار زریر خان نے کہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے جیسے صبا میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی تھی۔“ نگہت بیگم نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔ ورنہ آج کے ہی دن وہ آفتاب کے ساتھ اسی جگہ منگنی کیوں کرتی۔؟ کچھ دن رکا بھی جاسکتا تھا۔“ زریر خان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”مجھے صبا نے بتایا تھا کہ وہ آفتاب کے ساتھ آج اسی جگہ منگنی کر رہی ہے۔ پھر اس نے مجھے آفتاب کے بارے میں بتایا۔ اور آخری فقرہ اس کا میرے لئے بھی حیران کن تھا۔“ زریر خان نے کہا۔

”وہ کیا تھا۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔

”اس نے کہا کہ ایک گھوڑا آگے نکل گیا ہے۔ وہ گھوڑا انعام جیت گیا ہے۔“ زریر خان نے بتایا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ہماری شرط کے بارے میں وہ جانتی ہے۔“

”وہ کیسے جان سکتی ہے۔ ہم تین ہی اس بارے میں جانتے ہیں۔“ نگہت بیگم نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے شک ہے۔ وہ جانتی ہے۔ کیسے۔؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔“ زریر خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ جانتی ہے تو پھر کہیں وہ ہمیں بھی مہروں کی طرح تو نہیں استعمال کر رہی

تھی۔؟“ نگہت بیگم نے کہا۔

”اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔“ زریر خان نے کہا۔ ”یہ بتاؤ تم آج منگنی میں آ رہی

ہو۔؟“

”ابھی سوچا نہیں ہے۔“ نگہت بیگم نے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”تم آ جانا کیا ہے۔ ہم مل کر دیکھیں گے کیا خیال ہے۔؟ سوچ لینا۔ میں اب چلتی

ہوں۔ مجھے ایک جگہ اور بھی جانا ہے۔“

☆.....☆.....☆

ڈرائنگ روم میں سب ہی جمع تھے۔

یہ بات اب خاندان میں مخفی نہیں رہی تھی کہ صبا کی منگنی آفتاب نام کے ایک لڑکے کے ساتھ ہو رہی ہے۔ خاندان میں کچھ باتیں ابھریں اپنی دانست کے مطابق تبصرے ہوئے کچھ ہنسے کسی نے تاسف کیا اور پھر اس موضوع کو پرانا جان کر سب ہی صبا اور آفتاب کی منگنی کی تیاری میں مشغول ہو گئے تھے۔

فیاض احمد کے بنگلے میں سب جمع تھے۔ فرح بھی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ فیاض احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس پر میں کیا کہوں۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ ہماری طرف سے کوئی ایسی بات نہیں نکلی۔“

”میرے خیال میں ہمیں سب کچھ بھول جانا چاہئے۔“ اولیس نے کہا۔

”یاد رکھنے والی کوئی بات ہے ہی نہیں۔“ عاشر نے بھی فوراً کہا۔

”جو ہوا ٹھیک ہوا۔“ کا شان نے کہا۔

عاشر نے نگہت بیگم کی طرف دیکھا جو چپ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس گیا اور ساتھ

والی کرسی پر بیٹھ کر نگہت بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا اور پیار سے بولا۔ ”مما آپ مجھ سے ناراض

ہیں۔؟ پلیز اپنی ناراضگی ختم کر دیں۔ میں صبا سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مزاج یورپ

کے موسم کی طرح ہے۔ کبھی بھی بدل سکتا ہے۔ اچھا ہوا کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ یہ اور بھی اچھا

دھڑکن

ہوا کہ ہماری طرف سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس وقت خاندان میں اگر کچھ کہا جا رہا ہے تو وہ صبا کی فیملی کو کہا جا رہا ہے۔ ہم پر کوئی انگلی نہیں اٹھا رہا ہے۔ میرے اوپر سے جیسے ایک بوجھ سا اتر گیا ہے۔ میرا دل مطمئن ہے۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا تھا جبکہ حقیقت تو یہ ہے.....“ عاشر کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے اُدھورے جملے نے سب کو ایک بار اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرح نے بھی اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں تھیں۔ نگہت بیگم نے بے شک اس کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن وہ بھی جاننے کے لیے بے تاب سی ہو گئی تھی کہ عاشر کیا منکشف کرنے والا ہے۔

”تم کیا بتانے والے تھے؟“ جب اولیس سے برداشت نہ ہوا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔ عاشر نے ایک بار فرح کی طرف دیکھا اور پھر نگہت بیگم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”صبا سے اپنی منگنی ٹالنے کے لیے میں فرح کو اس گھر میں لے آیا تھا۔ میں نے اس سے نکاح کیا ہی نہیں ہے۔“

اس انکشاف نے سب کو حیران کر دیا۔ نگہت بیگم نے بھی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ فرح بھی پر سکون سی ہو گئی تھی۔ فیاض احمد نے بھی اپنے تئیں چونکنے کی اداکاری کی تھی۔

”تم نے اس سے نکاح نہیں کیا ہے؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”ہاں.... یہ میرے آفس میں کام کرتی ہے۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اس کام کے لیے رضا مند کیا تھا۔ لیکن صبا نے میرے لئے اور بھی آسانی کر دی۔ اگر آفتاب پہلے آ جاتا تو شاید ایسی نوبت ہی نہ آتی۔“ عاشر نے بتایا۔

”تم نے ہمارے ساتھ کھیل کھیلایا؟“ نگہت بیگم نے کہا۔ اسے غصہ آنے لگا تھا۔

”اُس کھیل سے یہ چھوٹا کھیل تھا جو آپ کے ساتھ صبا کھیلنے والی تھی۔ یہ تو آفتاب جلدی آ گیا اور منگنی ہوئی ہی نہیں۔ اگر آفتاب ہماری منگنی کے بعد آتا تو آپ کی پہنائی ہوئی انگلی آپ کو ایک میں جج کرواپس ملتی۔“ عاشر نے مزید بتایا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ نگہت بیگم نے کہا۔

دھڑکن

”آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ اور مجھے بھی یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ صبا کی آج منگنی ہے۔ اور فرح ابھی یہاں سے چلی جائے گی۔ سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔ میں نے کیا کیا کسی کو کوئی خبر نہیں ہوگی اور جو صبا نے کر دیا ہے وہ سارا خاندان جان گیا ہے۔“ عاشر نے اطمینان سے کہا اور اُٹھ کر فیاض احمد کے پاس جا کر بولا۔ ”آپ سے بھی سوری، اولیس بھائی اور کاشان سے بھی معذرت اور دونوں بھائیوں سے بھی میں معافی مانگتا ہوں۔“ عاشر نے سب کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ”ایم سوری۔ میرا یہ مجبوری میں اٹھایا ہوا قدم تھا۔“

نگہت بیگم چپ رہی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اپنے سارے غصے کا اظہار وہ عاشر پر نکال دینا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے منہ پر صبا نے چپ کی ٹیپ لگا دی تھی۔ اگر صبا نے انکار نہ کیا ہوتا تو شاید وہ عاشر کو بہت کچھ کہنے میں اس طرح سے خاموشی کا اظہار نہ کرتی۔ نگہت بیگم نے مناسب یہ ہی خیال کیا کہ وہ اب اس بات کو طول دینے کی بجائے اسی جگہ ختم کر دے۔

عاشر نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں نے جو بھی کیا اس کی ہوا باہر نہیں جانی چاہئے۔ اس چھت تلے جو بھی ہوا وہ خاموشی سے ہوا اور خاموشی سے ختم ہو گیا ہے۔ یہ قصہ یہی ختم ہوتا ہے۔“

”کوئی بات باہر نہیں جائے گی۔ سب ختم۔“ کاشان نے اس کی تائید کی۔

”تم میں سے کون کون صبا کی منگنی پر جانا چاہتا ہے؟“ نگہت بیگم نے اچانک سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس سوال کا جواب یا تو کسی کے پاس نہیں تھا یا پھر کوئی جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے یکدم سب ہی خاموش ہو گئے اور نگہت بیگم کا منہ دیکھنے لگے۔ نگہت بیگم نے جب کسی طرف سے کوئی جواب نہ سنا تو بولی۔

”ہم تو صبا کی منگنی میں جا رہے ہیں۔“

”ہم سے مراد.....؟“ فیاض احمد نے پوچھا۔

”ہم سے مراد..... ہم..... یعنی میں اور آپ۔“ نگہت بیگم نے وضاحت کی۔ ”میں اپنے

بھائی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب رسی کو پٹنیے کا کیا فائدہ۔“

”ہاں لیکن.....“ فیاض احمد نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن کیا.....؟ ہمیں نہیں جانا چاہئے... وغیرہ وغیرہ..... ہم جائیں گے۔ تم میں سے جس کی مرضی ہو وہ چلا جائے اور جو نہ جانا چاہئے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہمارا جانا مناسب ہے۔؟؟“ فیاض احمد نے سوال کیا۔

”کیوں مناسب نہیں ہے۔“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”صبا نے عاشر سے منگنی نہ کرنے کے لیے صاف جواب دیا ہے۔“

”عاشر چاہتا تھا کہ اس سے منگنی ہو۔؟“

”لیکن عاشر نے صبا کی طرح منہ بھر کر جواب نہیں دیا۔ خاندان میں وہ صبا کے گھر والوں

کے لیے رسوائی کا باعث نہیں بنا۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”ٹھیک ہے اگر آپ نہیں جانا چاہتے تو نہ جائیں۔ میں اکیلی چلی جاتی ہوں۔“ نگہت

بیگم نے لاپرواہی سے کہا۔

”مما..... ڈیڈ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔“ اولیس بولا۔

”عظیم کمال میرا بھائی ہے۔ میں اپنے بھائی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اکیلی چلی جاتی

ہوں۔“ نگہت بیگم نے کہا اور گردن کھڑی کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ سب

اسے جاتا ہوا دیکھتے رہ گئے تھے۔ فرح کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”تم میں سے جو جانا چاہئے میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔“ فیاض احمد نے

اولیس اور کا شان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اولیس نے آگے بڑھ کر عاشر سے کہا۔ ”مجھے ابھی احساس ہوا ہے کہ تم نے صبا سے منگنی نہ

کرنے کا فیصلہ ٹھیک کیا تھا۔“

”شکر ہے ایک ووٹ اور بڑھا۔“ عاشر اس کی طرف مسکرا کر بولا۔

”ایک اور سے مراد کیا ہے۔ تمہارا اس گھر میں اور بھی ووٹ بیلنس ہے کیا۔؟“ اولیس

نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”ایک میں خود جو ہوں۔“ عاشر نے فوراً کہا۔ ”میں فرح کو اس کے گھر تک چھوڑنے کے

لیے جا رہا ہوں۔“

فیاض احمد فرح کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے بولا۔ ”بیٹا اس گھر

میں اگر تم نے کچھ ایسا سنا جو تمہیں اچھا نہیں لگا تو میں سوری کرتا ہوں۔“

”نہیں انکل آپ کو سوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو شرمندہ کر رہے

ہیں۔“ فرح نے جلدی سے کہا۔

”خوش رہو۔“ فیاض احمد نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

فرح سب سے ملی اور اس کمرے میں چلی گئی جو اسے رہنے کے لیے دیا گیا تھا۔ جب وہ

واپس آئی تو نیچے عاشر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ باقی سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے

تھے۔ عاشر نے دیکھا کہ فرح نے وہ قیمتی سوٹ بدل لیا تھا جو ابھی اس نے پہنا ہوا تھا۔ وہ اپنے

سوٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف اپنا ہنڈ بیگ تھا۔

”تمہارا بیگ کہاں ہے۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”میں کوئی بیگ لے کر اس گھر میں نہیں آئی تھی۔“ فرح نے جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے کہ کپڑوں کی الماری میں تمہارے سوٹ لٹکے ہوئے تھے وہ تم لے کر

نہیں آئی۔“ عاشر نے وضاحت کی۔

”وہ میرے نہیں ہیں۔“

”اب وہ تمہارے ہو چکے ہیں۔ تم لے جاسکتی ہو۔“

”نہیں مجھے ضرورت نہیں ہے۔“

عاشر چپ ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ عاشر نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال

لی۔ فرح نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا ہی تھا کہ عاشر نے اسے آگے والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے

کہا۔ فرح اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگی۔ جیسے ہی

کار باہر نکلی بنگلے کا گیٹ چوکیدار نے بند کر دیا۔

دھڑکن

فیاض احمد اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک اُداسی سی تھی۔

☆.....☆.....☆

کار سڑک پر رواں دواں تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی حاکم تھی۔ فرح نے متعدد بار چورنگا ہوں سے عاشر کی طرف دیکھا تھا۔ جبکہ ایک بار بھی عاشر نے اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی تھی۔ اسی خاموشی میں وہ عمارت آگئی جس کی تیسری منزل پر فرح کا فلیٹ تھا، جو کہ عاشر نے اُسے دیا تھا۔ کار پارک کر کے دونوں ایک ساتھ باہر نکلے لفٹ میں داخل ہوئے اور اوپر پہنچ گئے۔

فلیٹ کے دروازے تک جا کر عاشر نے قفل میں چابی گھمائی، دروازے کا قفل کھل گیا۔ عاشر نے دروازہ کھولا اور فرح کو اشارہ کیا کہ وہ اندر چلی جائے۔ فرح نے کچھ ٹانے رک کر دیکھا اور پھر اپنا قدم اندر کی طرف بڑھایا، دوسرا قدم اندر رکھ کر وہ گھومی اور عاشر کی طرف دیکھ کر بولی۔

”شکریہ؟“

”نہیں... فرح تمہارا شکریہ تم نے میرا ساتھ دیا۔ دراصل ہم نے اپنی اپنی مجبوری کا سودا کیا تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ ہم دونوں کو سہارے کی ضرورت تھی۔ اور ہم ملے... ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی اور آج ہم یہاں الگ ہو رہے ہیں۔ میں پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ عاشر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ تو مجھے کرنا چاہئے۔ میں مجبور بے سہارا لاوارث لڑکی... اگر آپ نہ ملتے تو جانے میں کہاں ہوتی۔“ فرح نے کہا۔

عاشر نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چیک نکالا اور فرح کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”یہ تمہارا دس لاکھ روپے کا چیک۔“

فرح نے عاشر کی طرف دیکھ کر چیک کی طرف دیکھا اور کچھ دیر بعد اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں

دھڑکن

سے چیک پکڑ لیا۔ عاشر نے کہا۔ ”اب تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔ لیکن میں بھی ایک آفر کرتا ہوں۔ میری کمپنی میں تمہارے لئے ایک اچھی جاب ہے۔ چاہو تو تم مجھے میرے آفس میں مل سکتی ہو۔“

”شکریہ... میں سوچوں گی۔“ فرح نے آہستہ سے کہا۔

”میں چلتا ہوں۔“ عاشر نے کہا۔ اس نے ایک نظر فرح کی طرف دیکھا اور واپس جانے کے لیے چل پڑا۔ فرح نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا اور فلیٹ کا دروازہ بند کر کے اندر سے قفل کر دیا۔

فرح نے اندر جا کر فلیٹ کو روشن کیا۔ اپنی نظریں گھما کر دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑے چیک کو غور سے دیکھا۔ سامنے اس کی ماں اور باپ کی تصویر چھوٹے فریم میں لگی ہوئی تھی۔ فرح بولی۔

”اس دنیا کا اصول ہے کہ جس کے پاس سائبان اور پیسہ نہیں ہے وہ لاوارث ہے۔ کمزور ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ آج میرے پاس سائبان بھی ہے پیسہ بھی ہے۔ اب میں لاوارث اور بے سہارا نہیں رہی اب کوئی بھی مجھے گھر سے نہیں نکال سکے گا۔ کوئی نہیں۔“ فرح کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

عاشر جیسے ہی واپس جانے کے لیے مڑا تھا اس نے لفٹ کی بجائے سیڑھیوں کو نیچے جانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ مسرت سے سرشار تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہے، وہ ہوا میں روتی کے گولے کی طرح اپنے آپ کو اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ سیڑھیاں اُترتے ہوئے مسکرا رہا تھا، ایک پائیدار اُترتے ہوئے اُسے مزہ آ رہا تھا۔ اب کوئی ڈر نہیں تھا، کوئی خوف نہیں تھا، کوئی اندیشہ اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنا ہوا تھا۔ وہ آزاد ہو گیا تھا۔ وہ جھومتا ہوا سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ اُس نے گزرے ہوئے وقت کو خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ فرح بھی گزرے لمحوں کا ایک حصہ بن گئی۔

☆.....☆.....☆

پورا ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ باتوں، سرگوشیوں، تہقہوں، گھومتی آنکھوں، مسکراہٹوں، کی جھلمل سی بکھری ہوئی تھی۔ ہر ایک کے پاس بات کرنے کا کوئی نہ کوئی موضوع



دھڑکن

تھا۔ ہنسنے کی کوئی وجہ تھی کہ نہیں لیکن وہ دوسرے کا ہنسنے میں ساتھ دے رہا تھا۔ صبا اور آفتاب کی منگنی میں ہر کوئی بن ٹھن کر آیا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کسی فیشن شو میں شریک ہیں۔ نوجوان لڑکے بھی کسی نہ کسی کو متاثر کرنے کی سعی میں تھے۔ سامنے بنا ہوا اسٹیج ابھی خالی تھا۔ صبا ابھی نہیں آئی تھی۔ آفتاب کی طرف سے اس کی ماں، بھائی، بہن اس کا شو ہر اور بشیر جیلانی اور اس کی فیملی نے ہی آنا تھا، ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ ان سب سے الگ تھلگ نگہت بیگم اور زریں خان براجمان تھیں۔ ان کا موضوع ہی الگ تھا۔ چند دن بعد شروع ہونے والی گھوڑوں کی ریس کی باتیں کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے مشورہ کر رہی تھیں، انہیں کس گھوڑے کو اپنے لئے منتخب کرنا ہے۔ نگہت بیگم کو بہت سے ایسے سوالوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا جو صبا اور عاشق کے متعلق تھے۔ نگہت بیگم کو زیادہ صفا کی پیش نہیں کرنی پڑی تھی، سب کی دانست میں صبا نے ٹھیک نہیں کیا تھا اور اس سے ایسی ہی امید کی جاسکتی تھی۔

نگہت بیگم زریں خان سے باتیں کر رہی تھی لیکن اس کی نظریں ہال میں موجود ان لڑکیوں پر گھوم رہی تھیں، جو ابھی شادی شدہ نہیں تھیں۔ نگہت بیگم کا خیال تھا کہ وہ اس تقریب میں آکر یہ فائدہ ضرور اٹھانے کی کوشش کرے گی کہ کسی ایسی لڑکی کو عاشق کے لئے منتخب کر لے جو صبا سے اچھی تو ہو ہی عاشق بھی انکار نہ کر سکے۔ نگہت بیگم نے تین لڑکیاں اپنی نظر میں کر لی تھیں۔ اس کی دانست میں تینوں لڑکیاں عاشق کے لئے انتہائی موزوں تھیں۔ اور ان تینوں لڑکیوں کے بارے میں جان کر وہ کسی ایک کا انتخاب ضرور کر لے گا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ زیادہ دن حائل نہیں ہونے دے گی اور عاشق کی منگنی اس سے بھی زیادہ دھوم سے کرے گی۔

ہال میں اس وقت ایک ہلچل سی برپا ہو گئی تھی جب صبا دلہن کی طرح سج کر اسٹیج پر آ گئی تھی۔ اس کی عمر کی لڑکیاں اس کے ارد گرد جمع ہو گئی تھیں۔ عذرا کے چہرے کی مسکراہٹ چہرے کا ایک حصہ بنی ہوئی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ آفتاب بھی بہترین سوٹ میں ملبوس اپنی اور بشیر جیلانی کی فیملی کے ساتھ آ گیا تھا۔ آفتاب صبا کے برابر میں اسٹیج پر بیٹھ گیا تھا۔ مہمانوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ سب ہی اسٹیج کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ آفتاب اور صبا بہت ہی خوش دکھائی دے رہے تھے۔

دھڑکن

کچھ ہی دیر میں منگنی کی رسم شروع ہو گئی تھی۔ آفتاب اور صبا نے ایک دوسرے کو قیمتی انگوٹھیاں پہنا دی تھیں۔ اس کے بعد سب نے باتوں اور تمقہوں میں کھانا کھایا اور رات گئے منگنی کی رسم اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

شیردل کے آدمی شہر میں جہاں تک ہو رہا تھا، فرح کو تلاش کر رہے تھے۔ انعام کی لالچ میں خالہ اور خالو بھی اس کی تلاش میں تھے۔ خالو تو اس آفس میں بھی گیا تھا جہاں فرح کام کرتی رہی تھی لیکن اسے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ دونوں اس بات کی کھوج میں بھی تھے کہ آخر شیردل اس کی تلاش کیوں کر رہا ہے؟ فرح کے بارے میں جب شیردل کو نا کامی ہوئی تو وہ پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے تلاش جاری رکھی تھی۔

○○○

”میں سب کی بات نہیں کر رہا، اپنے جیسوں کے بارے میں بول رہا ہوں۔“ خاور نے

کہا۔

”یہ بتاؤ کون ہے وہ؟ رشتے دار ہیں کہ تم نے چھپ چھپا کر رشتے داری پہلے ہی بنالی

تھی۔؟“ عاشر نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

”یہ ایسا چہرہ کہاں ہے بھی کہ کوئی چھپ چھپا کر بات ہونے والی بات ہو جائے۔ مجھے تو

لڑکی دور سے دیکھ لے تو اُسے میں بھائی لگنے لگ جاتا ہوں۔ دو کہنیں تو بنا چکا ہوں۔“ خاور نے

ایک آہ بھر کر کہا۔

عاشر اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ ”تم آ جاتے ہو تو مزد آ جاتا ہے۔“

”رسم منگنی میں گئے تھے۔؟“ خاور نے پوچھا۔

عاشر بولا۔ ”نہیں.... جان چھوٹ گئی۔“

”اور... فرح....؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ

دیا۔

”وہ اپنی راہ پر اور میں اپنے رستے.... میں نے اسے آفر کی ہے کہ وہ چاہے تو میرے

آفس میں ایک اچھی جاب کر سکتی ہے۔ ابھی تک تو اس نے اس سلسلے میں رابطہ نہیں کیا۔“

خاور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا میرے لئے دعا کرنا.... میں جا رہا ہوں۔“

”ارے اتنی جلدی... چائے پیتے ہیں۔“ عاشر نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

”امی نے کہا تھا کہ میں آج جلدی آ جاؤں۔ مہمانوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان

بھی لے کر جانا ہے۔“ خاور بولا۔ ”پھر ملیں گے۔“

خاور اجازت لے کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد عاشر کسی کام سے باہر نکل گیا۔ جس عمارت کے

سامنے ابھی اس نے کار پارک کر کے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی نگاہ سامنے فضیلہ پر

پڑی۔ جو کہ اس عمارت سے نکل کر شاید اپنی کار کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے ہلکے رنگ کا

سوٹ پہنا ہوا تھا، چہرے پر ہلکا سا میک اپ تھا اور بال ہوا میں اُڑ کر اس کے چہرے پر آ جاتے

تو وہ اپنی انگلیوں سے اسے پھر پیچھے کر دیتی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ معصوم سی گڑیا

.....

عاشر اپنے آفس میں بیٹھا بڑے سکون کے ساتھ کام کر رہا تھا کہ خاور آ گیا۔

”سر سے پہاڑ کا بوجھ کیا اُترانا چیز کو یوں بھول گئے ہو گویا میں مس صبا کا ساتھ دے رہا

تھا۔“ اس نے آتے ہی کہا۔

”ارے آؤ... اگر تم نہ آتے تو میں تمہاری طرف آنے والا تھا۔“ عاشر نے اس کی طرف

مسکرا کر دیکھا۔

”خیریت سے آنے والے تھے ناں۔؟“ خاور نے پوچھا۔

”چائے پینے کے لیے، گپ شپ کرنے کے لیے اور رات کا کھانا کہیں باہر کھانے کا

منصوبہ بنانے کیلئے۔“ عاشر نے کہا۔

”آج میں فارغ نہیں ہوں۔ دراصل شام کو کچھ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آرہے

ہیں۔“ خاور نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تم کوئی کرتب کرنے والے ہو۔؟“ عاشر نے مسکرا کر پوچھا۔

”کیا یہ کرتب کم ہے کہ جب کسی لڑکے کو لڑکی والے دیکھنے کے لیے آتے ہیں تو وہ لڑکا

اپنی تمام تر معصومیت میں اپنی اصل چہرے کو چھپا کر اُن سے ملتا ہے۔“ خاور نے بلا تامل

کہا۔ ”مسکرا کر جھوٹ بولتا ہے اور اس کے جھوٹ کا ساتھ سب ہی دیتے ہیں۔“

”سب ایسے ہی تو نہیں ہوتے۔“ عاشر نے کہا۔

لگ رہی تھی۔ عاشر نے پہلی بار اُسے اتنے غور سے دیکھا تھا۔ اور پہلی نظر میں ہی اُسے وہ اچھی لگی تھی۔ وہ ٹٹکی باندھے اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا کہ فضیلہ اپنی نگاہیں جھکائے عاشر کے برابر سے گزری تو عاشر کی گردن بھی اسی سمت گھوم گئی۔

”کیا آپ مجھے جانتی ہیں۔“ اچانک عاشر نے پیچھے سے کہا۔

فضیلہ اچانک رکی اور اس نے گھوم کر اپنے عقب میں دیکھا اور جیسے ہی اس کی نگاہ عاشر پر پڑی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ”آپ.... ایم سوری میں نے دیکھا نہیں۔“

”یہاں کسی کام سے آئی تھی۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”کوئی کام تو نہیں تھا۔ میری ایک دوست کا یہاں آفس ہے۔ اس سے ملنے کے لیے آئی تھی۔“ فضیلہ نے بتایا۔

”کیا کرتی ہے وہ آپ کی دوست۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”آپ مجھے آپ نہ کہا کریں۔“ فضیلہ نے فوراً کہا۔

”کبھی آپ سے میرا مطلب ہے کہ تم سے بات ہی نہیں ہوئی بس ہیلو ہائے سے ہم آگے ہی نہیں بڑھے تھے اس لئے تم کہتے ہوئے زبان ساتھ نہیں دیتی۔“ عاشر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”باتیں تو ان سے ہوتی ہیں جو نظر آجائے۔ جو نظر نہ آئے ان سے تو ہیلو ہائے ہی ہوتی ہے۔“ فضیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب ہم دونوں کے درمیان باتیں ہو رہی ہیں کیا ہم ایک دوسرے کو نظر آ گئے ہیں۔؟؟“ عاشر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

تیز ہوانے فضیلہ کے بال اس کے چہرے پر کالی گھٹا کی طرح بکھیر دیئے تھے۔ اُس نے اپنے کھلے بال پھر سے پیچھے کئے اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کو پہلی بار یہاں دیکھا ہے۔ کیا یہاں آپ نے بھی کوئی آفس تو نہیں کھول لیا۔؟“

”ابھی تک تو نہیں کھولا۔“ عاشر نے جواب دیا۔ ”یہاں ایک اچھا ریسٹورنٹ بھی ہے۔ وہاں سے فاسٹ فوڈ بہت اچھا ملتا ہے۔ بھوک بھی لگ رہی ہے۔ کیا خیال ہے کچھ کھانا

پینا ہو جائے۔؟“

فضیلہ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں اس ریسٹورنٹ میں چلے گئے جو کہ اس عمارت کے گراؤنڈ فلور پر تھا۔ وہاں فضیلہ اپنی دوست کے ساتھ کئی بار آ چکی تھی اور اسے یہاں کا کھانا پسند بھی تھا۔

عاشر اور فضیلہ ایک طرف بیٹھ گئے تھے۔ دونوں نے اپنی اپنی پسند کا آرڈر دیا۔ اور باتیں کرنے لگے۔ یہ ان کی سب سے طویل ملاقات ہو رہی تھی۔ اس سے قبل کبھی وہ اس طرح سے نہیں ملے تھے۔ فضیلہ سے باتیں کرتے ہوئے عاشر کو محسوس ہوا تھا کہ فضیلہ کے اندر بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے وہ اپنی برتری ظاہر کرنے کی فکر میں ہو۔ اس کی باتیں اچھی تھیں اور مسکراہٹ ایسی دلکش تھی کہ عاشر کو خواہش ہونے لگی تھی کہ وہ مسکراتی ہی رہے۔ دونوں کھانے کے دوران بھی باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کی باتیں مختلف موضوعات کے گرد گھوم رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے بارے میں کوئی نہ کوئی سوال ہو جاتا تھا۔ دونوں لہجے کرنے کے بعد ہنستے مسکراتے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح عاشر ناشتے کی میز پر آیا تو نگہت بیگم اکیلی بیٹھی چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر وہ عاشر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ عاشر نے اپنی ماں کے چہرے پر تغیر دیکھا تو سلام کرنے کے بعد اس نے پاس ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”آج تو آپ کا موڈ بہت فریش نظر آ رہا ہے۔“

”میں نے سوچا جو ہو گیا اب اسے کسی ناراضگی یا دل میں کوئی بات رکھ کر کچے کچے رہنے کا کیا فائدہ۔ ایک چھت کے نیچے بہت سی باتیں ہو جاتی ہیں۔ ہمیں بھلا دینی چاہئے۔ کیا خیال ہے۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہت اچھا خیال ہے۔ ویسے اس سے پہلے کبھی آپ نے ایسا نہیں سوچا۔“ عاشر نے کہا اور دوسری بات بھی کہہ دی۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔ ”تم کیوں کہ سب سے بعد میں ناشتہ کرتے ہو اس لئے میں تمہارے انتظار میں یہاں بیٹھی تھی۔“

”کوئی خاص بات ہے۔؟“ عاشر نے چھری کا نٹا اٹھاتے ہوئے کہا۔

”سب سے تو میں نے بات کر لی ہے اب تم سے کرنے جارہی ہوں۔“ نگہت بیگم مسکرائی۔

”کیا بات ہے۔؟“ عاشر کا ماتھا ٹھٹکا۔

”اب تم فوراً شادی کر لو۔ تاکہ خاندان والے یہ خیال نہ کریں کہ عاشر کے لیے کوئی رشتہ ہی نہیں مل رہا ہے۔“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عاشر نے کہا۔ ”خاندان کے کسی فرد کے پاس ایسی باتیں سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ مرد کمانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ اس خاندان کی آدھی خواتین بھی اپنا کوئی نہ کوئی کام کر رہی ہیں۔ اور باقی بچتی ہیں وہ کسی نہ کسی سوشل پارٹی میں مصروف ہیں۔“

”پھر بھی میں نے فیصلہ کیا ہے اور سب نے اس کی تائید کی ہے۔ میں نے تمہارے لئے تین لڑکیاں دیکھی ہیں۔“ نگہت بیگم بولی۔

”تو اب میں تین لڑکیوں کے ساتھ شادی کروں گا۔؟“ عاشر نے چونک کر نگہت بیگم کی طرف دیکھا۔

”تمہیں ان تین لڑکیوں میں سے ایک کو اپنے لئے منتخب کرنا ہوگا۔“ نگہت بیگم نے وضاحت کی۔

”وہ تین لڑکیاں کون ہیں۔؟“ عاشر نے جاننا چاہا۔

”گھر والوں کو تو وہ تینوں ہی پسند ہیں۔ تم کسی ایک پر بھی انگلی رکھ دو گے تو سب کو اچھا ہی لگے گا۔“ نگہت بیگم پھر مسکرائی۔

”میں بھی تو جانوں۔؟“

نگہت بیگم نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا اور مسکرائی پھر بولی۔ ”ایک تو ہے ناویہ۔“ عاشر پہلا نام سن کر چونکا اور اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ وقف کے بعد

بولی۔ ”دوسری عاصمہ ہے۔“

”عاصمہ...؟ پھوپھو کی بیٹی۔؟“ عاشر نے کہا۔

”ہاں۔“

”اور تیسری کون ہے۔؟“ عاشر نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ وہ ناشتہ کرنا بھول گیا تھا۔

نگہت بیگم بولی۔ ”اور تیسری ہے... فضیلہ۔“

”فضیلہ۔“ اس نے وہ نام زیر لب دہرایا۔ تینوں لڑکیوں کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔ تینوں لڑکیاں خوبصورت تھیں، تعلیم یافتہ تھیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں سے کسی میں بھی صبا جیسی ایک بھی عادت نہیں تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو۔؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”بات ہی سوچنے کی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”تو بتاؤ پھر تم کس پر انگلی رکھتے ہو۔؟“ نگہت بیگم نے کہا۔

”مما... سوچ کر بتاؤں۔؟“

”کب بتاؤ گے۔؟“

”رات کے کھانے پر تو بتا ہی دوں گا۔“ عاشر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”اب تو کوئی ڈرامہ نہیں کرو گے ناں۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔

عاشر نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”نہیں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ مجھے اچھی طرح سے سوچ کر بتانا۔ میں اسی ہوٹل میں جلد تمہاری منگنی

اس دھوم سے کروں گی کہ ایسی منگنی خاندان میں کسی نے نہیں کی ہوگی۔“ نگہت بیگم نے اپنی

گردن کھڑی کرتے ہوئے کہا۔

”سب سے الگ اور سب سے منفرد منگنی ایک ہی طریقے سے ہو سکتی ہے کہ سب کی

آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔“ عاشر نے اچانک کہا۔

”وہ کیسے۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

عاشر نے کہا۔ ”ہم لڑکی کو دوسن کی انگوٹھی پہنائیں گے۔“ عاشر نے کہا اور ہنسنے لگا۔ اس کا



خیال تھا کہ ہنسنے میں اس کی ماں بھی اس کا ساتھ دے گی لیکن وہ سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔

”رات کے کھانے پر کسی اچھی خبر کے ساتھ ملاقات ہوگی۔“ نگہت بیگم جانے لگی تو اچانک اس نے رک کر پھر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”ایک بات یاد رکھنا عاشر۔۔۔ اب میں نے انتخاب کا حق تمہیں دیا ہے۔ تم پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس رہی ہوں۔“

”کیوں آپ نے پھر بھی اپنی مرضی کا رکھا ہے۔“ عاشر نے کہہ دیا۔  
”تو کیا سارے شہر کی لڑکیوں کی تصویروں کا ڈھیر تمہارے آگے لگا دوں۔؟“ نگہت بیگم نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں نے ایسے ہی کہا تھا۔“ عاشر فوراً مسکرا دیا۔

☆.....☆.....☆

عاشر نے سوچا کہ شادی تو اُسے کرنی ہی ہے۔ بزنس بھی سیٹ ہو گیا تھا۔ کوئی ایسا شوق بھی اس نے نہیں پالا تھا جو کہ اس کی شادی میں مانع ہو۔ اپنے کام کے دوران جب بھی اسے موقع ملتا ان تین لڑکیوں میں سے ایک کو منتخب کرنے کے بارے میں سوچنے لگ جاتا تھا۔ شام کو خاور اپنے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ نمودار ہو گیا تھا۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے یہ خوش خبری دی کہ لڑکی والوں نے کمال ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے پسند کر لیا ہے۔ اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ آج میرے ماں باپ بھی اس لڑکی کو پسند کر آئے ہیں اور اگلے ہفتے منگنی کی ایک رسم طے پاگئی ہے۔

عاشر نے پہلے تو اسے مبارکباد دی اور پھر اس کے آگے اپنا مسئلہ بھی رکھ دیا۔ اس کی بات سن کر خاور سوچنے لگا۔ اس نے ایک نادیدہ کو ہی دیکھا تھا۔ باقی دو کو تو وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ اس لئے کسی ایک کے بارے میں اپنی کوئی رائے دینا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“

”ہاں پوچھو۔“

”تمہارے سینے میں کوئی دل نام کی چیز دھڑکتی ہے۔؟“

”وہ دھڑکتی ہے تو میں زندہ ہوں۔“ عاشر نے جواب دیا۔

خاور نے اس کی طرف جھک کر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل نزدیک کر کے کہا۔ ”اگر دل دھڑکتا ہے تو کبھی اس کی بھی آواز سنو۔۔۔ وہ کیا کہتا ہے۔“

”دل کیا کہہ سکتا ہے۔؟“ عاشر نے اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

”بزنس میں کھو کر اپنی دل کی دھڑکنوں کی آواز کی پہچان بھول جانے والے میرے عزیز دوست۔۔۔ دل کی دھڑکنیں ہی سب کچھ کہتی ہیں۔ بس ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر میرا دل تو ان میں سے کسی ایک لڑکی کے لیے بھی راضی نہیں ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”دل راضی نہیں ہے۔؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ کوئی ایسا کھچاؤ۔۔۔ کوئی ایسی تڑپ نہیں ہے۔ بس ایک ہی بات ہے کہ کوئی فیصلہ کرنا ہے۔“ عاشر نے خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تو پھر تم کوئی بھی فیصلہ کر لو۔۔۔ تمہارے اس معاملے میں دراصل تمہارا دل آنا ہی نہیں چاہتا ہے۔“ خاور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

عاشر اس کی بات سن کر مسکرایا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ایسا بھی ہوتا ہے۔“ خاور نے کہا۔

”تمہاری منگنی میں تمہارا دل تمہارے ساتھ ہے کیا۔؟“ عاشر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

خاور نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں نے ابھی تک اس لڑکی کو نہیں دیکھا وہ کیسی ہے میں نہیں جانتا۔ لیکن میرا دل خوش ہے۔ میرے دل سے آواز آتی ہے کہ میرے ماں باپ نے میرے لئے اچھا انتخاب کیا ہے۔ میں سرشار ہوں۔۔۔ میرے دل کی دھڑکن اس کے خیال

دھڑکن

سے تیز ہو جاتی ہے۔ میرے ہونٹ مسکرا اٹھتے ہیں۔ تب کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے جو میرے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔“

”یہ تم کیا بول رہے ہو۔“ عاشر بولا۔

”تم محسوس کرو۔“ خاور نے اس کے دل پر انگلی رکھ کر کہا۔

”کیسے۔؟؟“ عاشر نے کہا۔

”ابھی میں جاتا ہوں۔ تم تینوں کے بارے میں سوچو اور جس کے لیے تمہاری دھڑکن تیز ہو جائے وہی تمہاری زندگی کی ہمسفر ہوگی وہ تمہارے دل کا انتخاب ہوگی۔“ خاور نے کہا اور عاشر کو حیران چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنے کمرے میں عاشر تنہا کھڑا تھا۔ وہ حیرت سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اُن تینوں لڑکیوں کا نام بھی لیا تھا لیکن کسی کے نام نے اس کے دل میں کوئی تلاطم اور ہلچل برپا نہیں کی تھی۔

جب عاشر اپنے گھر پہنچا تو اس کا سامنا فیاض احمد سے ہو گیا۔ اس نے عاشر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کرسی پر رسالہ لے کر بیٹھ گیا۔ عاشر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ ہر پل کچھ سننے کے لئے مضطرب سا تھا۔ بار بار اپنے کان کھڑے کر لیتا تھا۔ اسی کشمکش میں اس نے کپڑے تبدیل کئے اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ تب تک ٹی وی والا ونچ میں سب ہی جمع ہو چکے تھے۔ عاشر نے باری باری ان سب کی طرف دیکھا۔

”آئیے جناب... آپ کا ہی انتظار ہو رہا ہے۔“ اولیس نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”کوئی خاص بات۔؟“ عاشر نے اس کی طرف دیکھا۔

”خاص بات تو آپ سنا نہیں گئے۔“ اولیس پھر مسکرایا۔

”تمہاری ممانے ایک بار پھر کمر کس لی ہے۔ اب تو ہم بھی چاہیں گے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک لڑکی کا نام لو تا کہ ہم شادی کی تیاری کریں۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”تو کیا پہلے آپ نہیں چاہتے تھے۔؟“ نگہت بیگم نے بات پکڑ کر فوراً کہا۔

دھڑکن

فیاض احمد گھبرا گیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ پہلے بھی میں چاہتا تھا اور اب بھی چاہ رہا ہوں۔“

”تو کیا سوچا تم نے عاشر۔؟؟“ منابل بول پڑی۔

”کس بارے میں۔؟“ عاشر نے حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”عاصمہ، نادیا اور فضیلہ کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔“ منابل نے کہا۔

”اوہ۔“ عاشر کو جیسے اچانک یاد آ گیا ہو۔ ”اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ پہلے کھانا تو کھا

لیں۔“ عاشر نے کہا۔

”پہلے خوشخبری بعد میں کھانا۔“ نگہت بیگم نے اپنا حکم سنایا۔

”کسی کا نام بھی لے لو۔ تینوں ہی اچھی لڑکیاں ہیں۔ کم از کم مجھے تو کوئی اعتراض نہیں

ہے۔“ فیاض احمد نے جلدی سے کہا۔

اس بار پھر نگہت بیگم نے اس کی بات پکڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے

اعتراض تھا کیا۔؟؟“

فیاض احمد زبردستی مسکرایا۔ ”میرا مطلب ہے کہ پہلے بھی نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے۔“

”ہاں بولو عاشر۔“ نگہت بیگم ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

عاشر نے سوچا کہ خاور کہہ رہا تھا کہ جس کا نام لو گے تمہارے دل کی دھڑکن اس کے لیے

تیز ہو جائے گی۔ اس نے تینوں کا باری باری دل ہی دل میں نام لیا۔ پھر کچھ سننے کی کوشش

کی۔ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور دبی دبی مسکراہٹوں کے ساتھ ہنس بھی رہے تھے۔

”کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔“ کا شان بولا۔

”سوچ رہا ہوں۔“ عاشر نے کہا۔

”سوچنے کے لیے کتنا وقت لو گے۔ ایک نام لے دو بس۔“ سبینا نے کہا۔

عاشر نے ایک بار پھر اپنی زبان سے تینوں کے نام لئے جو صرف وہ ہی سن سکا

تھا۔ ”نادیا... عاصمہ... فضیلہ...“ پھر وہ چپ ہو گیا۔ کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے سر

جھٹک دیا اور بڑبڑایا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ خاور نے بے وقوف بنایا ہوا ہے۔“

”کیا کہا؟“ اویس نے فوراً کہا۔

عاشر چونکا۔ ”کچھ نہیں۔“ پھر وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے سوچا ہے کہ..... میرا خیال ہے کہ..... مجھے لگتا ہے کہ..... فضیلہ ٹھیک ہے۔“

سب پر مسرت نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ تب اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ ان سب کی رائے بھی فضیلہ پر ہی معدوم ہوتی تھی۔ اس رات مٹگنی کی پارٹی میں گہمت بیگم نے فضیلہ کو ہی اپنی نگاہ میں کیا تھا۔ اس طرح سے سب ہنستے ہاتیں کرتے کھانا کھانے لگے۔

☆.....☆.....☆

رات آدھی ہو چکی تھی۔

عاشر ابھی تک اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا۔ وہ بار بار سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سائید ٹیبل کے لیمپ کو روشن کر لیا تھا۔ پھر اس نے سامنے دیوار کی طرف دیکھا۔ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو اپنے سر کے بالوں میں پھیر کر اپنے موبائل پر نظر ڈالی اور اسے اُٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ کئی تیل جانے کے بعد دوسری طرف سے نیند میں ڈوبی خاور کی آواز ابھری۔

”کیا ہو گیا؟؟“

”تم نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا ہے؟“ عاشر نے کہا۔

”کس چکر میں ڈالا ہے؟“ خاور نے اسی لہجے میں کہا اور جماہی لی۔

”میں نے آج کئی بار ان تین لڑکیوں کا نام لیا لیکن کوئی بھی دھڑکن میرے اس نام لینے کے ساتھ نہیں دھڑکی۔ جب میں نے فضیلہ کا نام سب کو بتایا تو تب بھی کچھ نہیں ہوا۔ دل پر سکون کسی ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح اپنی موج میں رہا۔ کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوا۔“ عاشر نے بتایا۔

”تو اب کیا بات ہے؟“ خاور نے پوچھا۔

”میں ہوں کہ اسی بات پر سوچے جا رہا ہوں اور نیند ہے کہ آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”اس کا حل تم نے یہ نکالا کہ خاور کیوں خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔ اسے بھی جگا لیا جائے۔“

”اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ جب ایسا ہوتا ہی نہیں ہے تو تم نے کیوں مجھے خواہ مخواہ اس چکر میں ڈال دیا۔“

”اگر بتا دیا تو پھر تم فون بند کر کے مجھے سونے دو گے۔؟“

”ہاں پھر میں فون بند کر دوں گا۔“

”تو پھر سنو... اس فیصلے میں تمہارے دل نے تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ دماغ میں اس کا نام آیا... اس کا خیال آیا اس کی سوچ آئی، تجھے ایسا لگا اور تمہاری زبان سے وہ نام ادا ہو گیا۔ اس لئے تمہارے دل کی دھڑکن اپنی موج میں رہی۔ گڈ نائٹ۔“ خاور نے بتایا اور خود ہی فون بند کر دیا۔ عاشر سوچتا ہی رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

خاور ابھی اس عمارت میں داخل ہوا ہی تھا جہاں اس کی کمپنی کا آفس تھا کہ یکدم فرح اس کے سامنے آگئی۔ خاور اسے اچانک دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ اس نے خوشگوار حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”ارے تم..... اچانک....“

”میں ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ فرح نے کہا۔

”خیریت تو ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں... بس ایک چھوٹا سا کام تھا۔“ فرح بولی۔

”آؤ میرے آفس میں چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔“

”نہیں مجھے جلدی ہے۔“

”یہاں کسے جلدی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی بہت فرصت ہے۔“ خاور مسکرایا۔  
 ”میں واقعی جلدی میں ہوں۔“ فرح نے کہا اور پھر اپنے بینڈ بیگ سے ایک خاکی لفافہ  
 جسے بڑی اچھی طرح سے بند کیا ہوا تھا وہ نکالا اور خاور کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”آپ سے  
 ریکویسٹ ہے کہ یہ لفافہ آپ عاشر کو دے دیجئے گا۔“

خاور نے اس خاکی لفافے کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”اس میں  
 کوئی پھٹ جانے والی چیز تو نہیں ہے نا۔“  
 فرح بھی اس کی بات سن کر ہنس پڑی۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”جسٹ فار جوک۔۔۔ میں آپ کی یہ امانت آج دوپہر تک عاشر کو پہنچا دوں گا۔ بلکہ ابھی  
 کچھ ہی دیر میں میرے آفس کا ایک آدمی اس کے آفس کی طرف جائے گا۔ میں اُسے دے  
 دوں گا۔“ خاور نے کہا۔

”شکریہ۔۔۔۔۔ میں چلتی ہوں۔“ فرح نے کہا۔

”آپ نے چائے نہیں پی۔“

”میں نے ناشتہ کر لیا تھا۔“ فرح نے کہا اور اجازت لے کر وہاں سے چلی گئی۔

خاور اپنے آفس کی طرف جاتے ہوئے اس خاکی لفافے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ  
 اس لفافے میں کیا ہے۔ فرح نے یہ لفافہ خود عاشر کو دینے کی بجائے یہ ذمہ داری اسے کیوں  
 سونپی ہے۔؟

☆.....☆.....☆

ایک گھنٹے کے بعد وہ خاکی لفافہ عاشر کی میز پر پڑا تھا۔ اس لفافے کے باہر لینے اور بھیجنے  
 والے کا نام نہیں لکھا تھا۔ عاشر کو بتایا گیا تھا کہ یہ لفافہ خاور نے بھیجا ہے۔ عاشر نے اس لفافے  
 کی طرف دیکھا اور سوچا کہ خاور نے ضرور کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کی ہوگی۔ عاشر نے اس  
 خاکی لفافے کی طرف دیکھا اور پھر اُسے ایک طرف سے پھاڑ دیا۔ عاشر نے لفافے کے اندر  
 جھانکا ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا۔ وہ نکال کر اس نے لفافہ اُلٹ دیا۔ لفافے کے اندر سے چابی

نکل کر میز پر گر گئی۔

عاشر نے چابی اٹھا کر دیکھا اور پھر تہہ کیا ہوا کاغذ کھولا اس کے ساتھ اس کا دیا ہوا دس  
 لاکھ روپے کا چیک تھا۔ اور کاغذ پر ایک مختصر سی تحریر لکھی ہوئی تھی۔ عاشر وہ تحریر پڑھنے لگا۔ اس پر  
 لکھا تھا۔

عاشر صاحب!

میں نے بہت سوچا اور پھر اس فیصلے پر پہنچی ہوں کہ میرے لئے وہ دو لاکھ روپے ہی بہت  
 تھے جو آپ نے ادا کئے اور مجھے قرض سے نجات مل گئی۔ میں یہ دس لاکھ روپے کا چیک اور آپ  
 کے دیئے ہوئے فلیٹ کی چابی آپ کو واپس کر رہی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں میں یہ سب واپس  
 کرنے کے لیے آپ کے پاس نہیں آ سکی اور اس کے لیے خاور بھائی کا سہارا لے رہی  
 ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا ہوا تھا۔ عاشر نے ایک دو بار اس تحریر کو پڑھا۔ اور پھر کاغذ  
 میز پر رکھ دیا۔

عاشر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”میرے لئے وہ فلیٹ اور دس لاکھ روپے تمہیں دینا کوئی  
 معنی نہیں رکھتے تھے۔ میں نے تو یہ احساس کیا تھا کہ تم بے سہارا ہو اس بہانے تمہاری مدد  
 ہو جائے گی لیکن جانے کیوں تم نے یہ سب مجھے واپس کر دیا ہے۔“

عاشر نے فلیٹ کی چابی اور چیک اپنی دراز میں رکھا اور کاغذ کو پھاڑ کر ٹکڑوں میں تبدیل  
 کر کے جیسے ہی وہ انہیں کوڑے کی ٹوکری میں پھینکنے لگا یکدم اُسے محسوس ہوا جیسے اس کا دل زور  
 سے دھڑکا ہے۔ اس کا ہاتھ اسی جگہ رک گیا۔ اس نے اپنے دل کی دھڑکن پھر محسوس کی اور خاور  
 کی آواز جیسے اس کے کان میں پڑی۔ جس کے لیے تمہارے دل کی دھڑکن تیز ہو جائے وہی  
 تمہاری ہمسفر ہوگی اُسی کے ساتھ تمہارا دل ہوگا۔

عاشر کے چہرے پر متانت تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا میرا دل فرح کے لیے دھڑکا  
 ہے۔؟ تب کچھ نہیں ہوا تھا جب اس نے فضیلہ کا نام لیا تھا۔ دل کی دھڑکن میں ایسا ارتعاش پیدا  
 نہیں ہوا تھا۔ فرح کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا اس کی مسکراہٹ اس کی



دھڑکن

متانت اس کا چپ چہرہ اس کا اس کی طرف چورنگا ہوں سے دیکھنا جس کی طرف اس نے تب دھیان نہیں دیا تھا اور جب وہ اسے چھوڑنے کے لیے فلیٹ کی طرف جا رہا تھا تو فرح کی خاموشی میں ایک بے قراری تھی شاید کچھ کہنے کی یا پھر... کچھ سننے کی... معاشر کا دل پھر دھڑکا اور اس نے مضطرب ہو کر بند مٹھی کھولی اور ان ٹکڑوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور اس کی متلاشی نگاہیں جیسے ان ٹکڑوں میں اسے تلاش کر رہی ہوں۔ پہلی بار فرح اس کی آنکھوں میں جیسے بس سی گئی ہو۔ وہ ان ٹکڑوں کو دیکھے جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

فرح نے خاور کو وہ خاکی لفافہ دے کر جب اس سے جانے کی اجازت لی تھی تو وہ سیدھی اس عمارت سے باہر نکل گئی تھی۔ اُس نے اپنا بیگ سامنے ایک پی سی او کے کیبن میں بیٹھی ہوئی خاتون کے پاس رکھوایا تھا۔ فرح نے اس کا شکریہ ادا کر کے اپنا بیگ لیا اور ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔ رکشہ جلد ہی اُسے شہر کے ریلوے اسٹیشن لے گیا تھا۔ اپنا بیگ پکڑے جب فرح ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے اندر جانے کے لیے تیز تیز بڑھ رہی تھی تو اس نے گیٹ کے پاس جا کر اپنے قدم روک لئے اور گھوم کر اس شہر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اُداس ہو گیا تھا آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ فرح نے وہ نمی اپنی شہادت کی اُنکلی سے صاف کی اور پھر ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے اندر چلی گئی۔

وہ ٹکٹ کل ہی لے آئی تھی۔ ٹرین چلنے میں پندرہ منٹ رہتے تھے۔ فرح کے قدم سست ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ اُداس ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ زبردستی قدم اٹھا رہی ہے۔ جبکہ اس کا دل اس شہر سے جانے کے لیے مائل نہیں ہے۔

”فرح“ ایک تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ فرح نے اپنے قدم روک کر یکدم اپنی گردن گھما کر اُمید کی کرنوں بھری نگاہوں سے اپنے عقب میں دیکھا۔ وہ ایسی ہی آواز سننا چاہتی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے آواز دینے والے کو دیکھا۔ وہی آواز پھر گونجی۔ ”فرح... واپس آ جاؤ... گم ہو جاؤ گی۔ کم آن۔“

دھڑکن

فرح کی نگاہیں اس کہنے والے پر منجمد ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اُمید کی کرنیں یکدم معدوم ہو گئی تھیں۔ چہرے کی اُداسی گہری ہو گئی تھی۔ ہونٹ تھرتھرا سے گئے تھے۔ دھڑکن پھر سے پرسکون ہو گئی تھی۔ وہ شخص اپنی سات سال کی بچی کو آواز دے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی بچی کو سمجھایا تھا۔ اس کی بچی رک گئی تھی۔ وہ شخص اس کی طرف بڑھا اور اپنی گود میں اٹھا کر واپس پلٹ گیا تھا۔ فرح کھڑی دیکھتی رہی تھی۔

وہ پھر گھومی اور جانے کے لیے اپنے قدم اٹھانے لگی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”تجھے کوئی آواز کیوں دے گا...؟ کون ہے تجھے آواز دینے والا... کسی خوش فہمی میں مت رہو اور چپ چاپ جس مسافت پر جا رہی ہو چلی جاؤ۔“

ان ہی خیالوں اور سوچوں میں فرح ٹرین میں سوار ہو گئی تھی۔ اس کی سیٹ کھڑکی کے ساتھ والی تھی۔ زیادہ رش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب ٹرین ریٹگنے لگی تو اس کے ڈبے میں مسافروں کا زیادہ رش نہیں تھا۔ خال خال مسافر کھلے ڈھلے انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹرین رفتہ رفتہ شہر کو چھوڑنے لگی تھی اور فرح کی مضطرب نگاہیں پلیٹ فارم کی طرف دیکھ رہی تھی جو کہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ٹرین نے اور رفتار پکڑ لی تھی۔ ہر چیز پیچھے کی طرف بھاگنے لگی تھی۔ فرح کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے جیسے دور ہوتی ٹرین کے ساتھ اس کی بندھی ہوئی اُمید بھی دانہ دانہ کر کے ٹوٹنے لگی تھی۔ اور جب ٹرین اور آگے چلی گئی تو فرح نے باہر دیکھنا بند کر دیا اور پرسکون سی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

تین گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ چھوٹا سا شہر آیا تھا۔ ٹرین سے اُتر کر فرح پیدل ہی بس اسٹینڈ کی طرف چلی گئی تھی جو کہ دور نہیں تھا۔ اس جگہ سے بس اس کے گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ اس کا گاؤں ابھی مزید آدھا گھنٹہ کی مسافت پر تھا۔

بس بھری تو وہ چلی۔ آدھے گھنٹے کا سفر اس بس نے جگہ جگہ رک کر ایک گھنٹے میں طے کیا تھا۔ فرح کے لیے سب سے زیادہ یہی سفر کوفت کا باعث تھا۔ تین گھنٹے کا سفر اس کے لئے اتنا

تکلیف دہ نہیں تھا جتنا کہ یہ سفر تھا۔

بس سے اتر کر وہ سڑک عبور کر کے سامنے ایک اینٹوں کی بنی سڑک کی طرف چلی گئی جو کہ اس کے گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ وہاں ایک تانگہ کھڑا تھا۔ پاس ہی بوڑھا کوچوان اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی فرح اس تانگے کے قریب گئی بوڑھے کوچوان نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”کہاں جانا ہے بیٹی؟“

”میں طفیل احمد کی پوتی ہوں۔ مجھے ان کے گھر جانا ہے۔“ فرح نے بتایا۔

”تم طفیل کی پوتی ہو۔ اب تو گھر میں اس کی بیوی ہی رہتی ہے۔“ بوڑھے کوچوان نے کہا۔

”ہاں وہ میری دادی اماں ہے۔“ فرح نے کہا۔

بوڑھے کوچوان نے جلدی سے فرح کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ جیسے ہی فرح پچھلی سیٹ پر بیٹھی اس نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔ فرح کئی سال کے بعد گاؤں میں آئی تھی۔ اُسے گاؤں میں ایسی کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی جو واضح دکھائی دے۔ وہی فصلیں، لہلہاتے ہوئے کھیت، وہی بھینی اور ہلکی ہوا، وہی دھول اور وہی رستہ تھا۔ کوچوان نے تانگہ اس کی دادی اماں کے گھر کے دروازے کے عین سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ فرح نے اتر کر کوچوان کو کرایہ دیا تو بوڑھے کوچوان نے کرایہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن فرح نے زبردستی اسے کرایہ دے دیا تھا۔

گھر کے دروازے کا ایک پٹ بند تھا جبکہ دوسرا آدھا کھلا تھا۔ فرح نے اندر قدم رکھ کر سامنے کشادہ اور کچے محن کی طرف دیکھا۔ محن میں ایک بکری اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھی، چند مرغیاں ادھر ادھر پھدک رہی تھیں، ایک طرف چار پائی بچھی ہوئی تھی اور اُس پر دادی اماں آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ فرح نے پاس جا کر آہستہ سے مخاطب کیا۔

”دادی اماں..... دادی اماں....“

یکدم دادی اماں چونکی اور آنکھیں کھول کر اُٹھتے ہوئے فرح کی طرف دیکھا۔ دادی اماں کی آنکھوں میں حیرت تھی اور آنکھیں فرح کے چہرے پر منجمد ہو گئی تھیں۔ اور بے یقینی کے انداز میں بولی۔

”فرح تم..... میری فرح....“ وہ یکدم جذباتی بھی ہو گئی تھی۔ فرح نے اپنا بیگ زمین پر رکھا اور دادی اماں سے لپٹ گئی۔ دادی اماں نے فرح کو بھرپور پیار کیا، اس کے سر پر بار بار ہاتھ پھیرا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر کہا۔ ”تو کب آئی.... اور اچانک آ گئی.... اکیلی آئی ہے کہ.....“ دادی اماں نے اپنا ادھورا جملہ چھوڑ کر متلاشی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

”دادی اماں.... میرے ساتھ کس نے آنا ہے۔ میں نے اکیلی نے ہی تو آنا تھا۔“ فرح نے مسکرا کر کہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”تو ٹھیک تو ہے۔“ دادی اماں نے اس کی آنکھوں میں اُتری ہوئی نمی اپنے ہاتھ سے صاف کی۔

”ہاں دادی اماں میں ٹھیک ہوں۔ آپ سناؤ آپ کیسی ہو۔“ فرح نے کہا۔ فرح کا جواب دینے کی بجائے دادی اماں نے یکدم پریشان سی ہو کر پوچھا۔ ”فرح.... تجھے کسی نے آتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟“

فرح متحیر نگاہوں سے دادی اماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”کیا مطلب ہے دادی اماں۔؟“ ”تجھے اس گاؤں میں کسی نے دیکھا تو نہیں ہے۔؟“ دادی اماں کی پریشانی اپنی جگہ قائم تھی۔

”میں تانگے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کسی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔“ فرح نے بتایا۔ ”کیا بات کیا ہے دادی اماں آپ یکدم گھبرا گئی ہیں۔“

”کچھ نہیں تم کھانا کھاؤ گی۔“ دادی اماں نے کہا اور چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”سالن ہے۔ بس روٹیاں ہی پکانی ہیں۔“

فرح نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں پہلے منہ ہاتھ دھو لوں۔“

”ہاں تم منہ ہاتھ دھو لو۔“ دادی اماں نے کہا اور چلتی ہوئی دروازے تک گئی، اس نے باہر دائیں بائیں جھانک کر دیکھا اور اسے بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ فرح دیکھ رہی تھی۔ سفر کی تھکان اور بھوک بھی خوب لگی ہوئی تھی اس لئے وہ منہ دھونے کے لیے پانی کے تلمکے کے

نے پوچھا۔

”خاص بات ہے۔“ مہنگا اور پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور ایک نظر وہاں کھڑے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ان کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتا ہے۔ شیردل نے اپنے پاس کھڑے ملازمین کی طرف دیکھا اور انہیں جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ سب باہر نکل گئے۔ مہنگا اس کا خاص آدمی تھا۔ پورے گاؤں کی ہی نہیں آس پاس کیا ہو رہا ہے اسے خبر ہوتی تھی۔

”اب بتا دوئے کیا بات ہے۔“ شیردل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مہنگا اس کے پیروں میں بیٹھ گیا اور بولا۔ ”چوہدری جی۔۔۔ ابھی ابھی میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ ان آنکھوں سے۔“

”کیا دیکھ کر آ رہے ہو تم ان آنکھوں سے۔؟“ شیردل کو کچھ بے چینی سی ہونے لگی تھی۔

”ابھی ابھی میں نے چھوٹی بی بی کو دیکھا ہے۔“ مہنگے نے کہا۔

”کون چھوٹی بی بی۔؟“ شیردل نے پوچھا۔

”چھوٹی بی بی۔“ مہنگے نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی تو پتہ چلے کہ کون چھوٹی بی بی۔؟ کسے دیکھ آیا ہے تو اوئے۔“ شیردل نے جھلا کر

کہا۔

”چوہدری صاحب۔۔۔ وہ جس سے آپ کی شادی ہونے والی ہے۔“ مہنگے نے یکدم

کہا۔

شیردل یکدم چونکا۔ جیسے اس کے پاؤں میں کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ اس نے مہنگے کی طرف

دیکھا۔ اور بولا۔ ”کیا کہہ رہا ہے تو۔؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں چوہدری صاحب۔ وہ تانگے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سیدھی اپنی دادی

اماں کے گھر گئی ہے۔“ مہنگے نے بتایا۔

شیردل متحیر نگاہوں سے مہنگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بے قراری اس کے چہرے سے مترشح

تھی۔ اور آنکھیں ناچ رہی تھیں۔ ”تو سچ کہہ رہا ہے مہنگے۔؟“

☆.....☆.....☆

وہ بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور دھوتی باندھی ہوئی تھیں۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ سر پر نیلے رنگ کا رومال باندھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے آگے سے اپنی دھوتی بھی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ فصلوں کے بیچوں بیچ بھاگ رہا تھا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ جلد از جلد اس خبر کو شیردل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا حویلی گیا اور باہر کھڑے ایک بوڑھے آدمی جس نے اپنے کندھے پر چارہ لادا ہوا تھا پوچھا۔

”چوہدری شیردل حویلی میں ہیں۔؟“

”جتنے کوئی کام ہے مہنگے۔“ اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ اندر ہیں۔“ جس کا نام اس نے مہنگا لیا تھا اس بار ذرا تیز لہجے

میں بولا۔

”ابھی ابھی ڈیرے کی طرف گئے ہیں۔ بات کیا ہے مہنگے۔؟“ اس نے بتا کر پھر جاننا

چاہا۔ مہنگے نے جواب دینے کی بجائے ڈیرے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ڈیرہ زیادہ دور

نہیں تھا۔ وہ جلدی ہی اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ڈیرے میں پہنچ گیا۔ سامنے چار پائی پر

گاؤ تکیہ لگائے شیردل بیٹھا ہی تھا۔ پاس ہی اس کے چند ملازم بھی کھڑے تھے۔ جیسے ہی اس کی

نگاہ مہنگے پر پڑی اس نے پوچھا۔

”کیا بات ہے مہنگے۔ کہیں سے بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔؟ کوئی کتا شتا تو نہیں پیچھے پڑ گیا۔“

”آپ جانتے ہیں کہ میں شیر سے نہیں ڈرنے والا کتا کی چیز ہے۔“

”پھر کیا بات ہے۔“

”جھوٹے چوہدری صاحب بات بڑی اہم ہے۔“ مہنگا اپنی پھولی سانس کے ساتھ اس

کے پاس ہی چلا گیا۔

”تیرے پاس کوئی بات ہو اور وہ اہم نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بتا کیا بات ہے۔“ شیردل

”میں نے کبھی پہلے کوئی غلط اطلاع دی ہے آپ کو جی۔؟“ مہنگے نے کہا۔

شیردل اس کی بات سن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مہنگا بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ شیردل نے کہا۔ ”ہم نے پچھلے دنوں اسے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا، جہاں رہتی تھی وہاں بھی گئے۔ وہ تو اچانک گم ہو گئی تھی۔ کہیں سے بھی نہیں ملی۔ اب اچانک وہ اس گاؤں میں آ گئی ہے۔“ شیردل نے گھوم کر مہنگے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مہنگے ابھی یہ بات کسی سے نہیں کرنی ہے۔ اپنے گھر جاؤ اور اپنی بیوی کو دادی اماں کے گھر کسی بہانے سے بھیجو۔ وہ دیکھے اور پھر مجھے بتاؤ۔ میں پوری تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ وہ فرح ہی ہے۔“

”میں ایسا کرتا ہوں لیکن میری نظر بھی کمزور نہیں ہے چوہدری صاحب۔“

”جا کر دیا کر جیسا میں نے کہا۔ اور مجھے فوراً بتاؤ۔“ شیردل نے ذرا سخت لہجے میں

کہا۔ وہ مضطرب ہو گیا تھا۔ ”میں یہی ہوں۔ اور تم دونوں کا انتظار کر رہا ہوں۔“

شیردل کے کہنے پر مہنگا تیزی سے باہر نکل گیا۔ شیردل حیران تھا کہ اچانک فرح گاؤں میں کیسے آ گئی۔ پھر اس نے خوش ہو کر اپنے آپ سے کہا، اس کا مطلب ہے کہ شکار خود چل کر اپنے جال کی طرف آ گیا ہے۔

☆.....☆.....☆

”دادی اماں سالن روٹی آپ ہی پکاتی ہو۔؟“ فرح نے روٹی کو دیکھتے ہوئے

پوچھا۔ جب وہ منہ ہاتھ دھو کر آئی تھی تو دادی اماں نے روٹی اور پلیٹ میں سالن ڈال کر چار پائی پر ہی رکھ دیا تھا۔ خود وہ ساتھ والی چار پائی پر براجمان ہو گئی تھی۔

”اور کون پکائے گا میرے لئے۔“ دادی اماں نے جواب دیا۔

”دادی اماں ہمارا یہاں اور کوئی نہیں ہے۔؟“ فرح نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے

پوچھا۔

”بہت ہیں۔ تیرے ابا کے تایا، چاچا ہیں ان کی اولادیں۔۔۔ لیکن کوئی بھی نہیں

ہے۔“ دادی اماں نے کہا۔

”کیا مطلب دادی اماں۔؟“ فرح نے دادی اماں کی طرف دیکھا۔

”تو روٹی کھا۔۔۔ باتیں تو پھر بھی ہو جائیں گی۔“ دادی اماں نے اس کی طرف پیار

سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کھا بھی رہی ہوں آپ مجھے بتاؤ بھی۔ میں تو بہت چھوٹی تھی جب ابو اس گاؤں

سے ہمیں لے کر شہر آباد ہو گئے تھے۔“ فرح نے کہا۔

”تب تو چھ سال کی تھی۔“ دادی اماں نے کہا اور سوچوں میں کھو گئی پھر یکدم بولی۔ ”فرح

تو تو شہر میں نوکری کرتی تھی۔ مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہے تو۔؟“

”نہیں دادی اماں۔۔۔ میں اب نوکری نہیں کرتی۔ خالہ اور خالو نے مجھے گھر سے نکل

جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔“ فرح نے بتایا۔

”اس نے ایسا کیوں کیا۔؟“ دادی اماں نے پوچھا۔

”لاوارث جو ہوں۔“ فرح بولی۔

دادی اماں کا دل جیسے پھٹ گیا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور فرح کو اپنے سینے سے لگا

لیا۔ اُس کا ماتھا چوما اور بولی۔ ”آئندہ ایسا نہ کہنا۔ ہمارا خدا ہے ناں۔“

اسی اثنا میں دروازے کی ٹھک۔۔۔ ٹھک نے دادی اماں کو چوکا دیا۔ اس نے گردن

گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ بوڑھے چہرے پر ایک عجیب سا خوف مترشح ہو گیا تھا۔ اس نے فرح کو آہستہ سے کہا۔

”فرح۔۔۔ تو اس کمرے میں چلی جا۔“

”کیا ہوا دادی اماں۔؟“ فرح نے متحیر ہو کر پوچھا۔

”جاؤ یہ روٹی اور سالن بھی لے جا۔ اور باہر نہ آنا جب تک میں آواز نہ دوں۔“ دادی

اماں نے کہا۔ اس دوران دروازے کی ٹھک ٹھک پھر ہوئی۔ دادی اماں نے فرح کو کمرے میں

بھیج دیا۔ فرح کچھ نہ سمجھتے ہوئے سالن روٹی بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

دادی اماں نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے نورائیں کھڑی تھیں۔ وہ مہنگے کی بیوی تھیں۔ دادی

اماں نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کا راستہ نہیں دیا تھا۔



دھڑکن

”اچار لینے کے لیے آئی ہوں۔ ابے کے پنڈ سے پھوپھی آگئی ہے۔ کہتی ہے کہ ہری مرچ کا اچار کھانے کو بڑا جی کر رہا ہے۔ میں نے کہا یہ بھلا کیا بات ہے۔ دادی نے اپنے ہاتھ سے ڈالا ہے۔ ابھی لے کر آتی ہوں۔“ نوران نے کہا۔ اور خود ہی راستہ بتاتی ہوئی اندر آگئی۔

”ٹھہرو میں لا کر دیتی ہوں۔“ دادی اماں نے جلدی سے کہا۔

”تو ہی لا کر دے گی میں تھوڑی خود لوں گی۔“ نوران نے کہا اور پھر پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ دادی اماں نے جیسے ہی اُسے دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھا وہ اور بھی گھبرا گئی اور بولی۔ ”تو نے دروازہ کیوں بند کر دیا نوران۔؟“

نوران نے جواب دینے کی بجائے دادی اماں کا بازو پکڑا اور ایک طرف لے جا کر اپنی آواز کو دھیمار کھتے ہوئے بولی۔ ”دادی۔۔۔۔۔ فرح آئی ہے کیا۔؟“

دادی اماں نے خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ تجھے کس نے کہا۔؟“

”مجھے مہنگے نے پتہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس نے فرح کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ مہنگے نے چھوٹے چوہدری کو بتایا تو اس نے تسلی کرنے کے لیے مجھے بھیجا ہے۔“ نوران نے کہا۔ ”دیکھ دادی میں بھلے مہنگے کی گھر والی ہوں۔۔۔۔۔ لیکن ایک عورت ہوں۔ سب جانتی ہوں۔ اور ایسا ظلم تیری پوتی پر ہو یہ میں بھی نہیں چاہتی۔“

دادی اماں نے نوران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”قسمت پھوٹ گئی کہ فرح آگئی ہے۔۔۔۔۔ دیکھ نوران شیردل کو اس بات کا پتہ نہ چلے۔ میں اندھیرا ہوتے ہی اسے یہاں سے بھیج دوں گی۔“

”دادی۔۔۔۔۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی لیکن مہنگے سے جھوٹ بول دوں گی۔ کچھ پتہ نہیں چلنے دوں گی۔ تو فرح کو اس پنڈ سے بھیج دے۔ کیسے بھی۔“ نوران نے ہمدردی سے کہا۔

”تیرا بھلا ہو نوران۔۔۔۔۔ ہم مجبور اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔“ دادی اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

دھڑکن

”میں چلتی ہوں۔ میری طرف سے فکر نہ کرنا۔ مہنگا تو شیردل کا کتا ہے۔ لیکن میری بھی فرح جتنی عمر کی بیٹی ہے۔“ نوران نے کہا اور باہر نکل گئی۔ دادی اماں نے دروازے کی پھر کنڈی لگا دی۔ جیسے ہی وہ پیچھے گھومی فرح اسے حیران کن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ساری باتیں سن لی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں سوالوں کا انبار تھا۔

☆.....☆.....☆

شیردل اپنے ڈیرے میں مضطربانہ انداز میں ٹہل رہا تھا اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے چمکتی ریت پر سانپ بل کھا رہا ہو۔ مہنگا پاس ہی کھڑا تھا۔ اچانک نوران آگئی۔ اسے دیکھتے ہی شیر دل نے اس کی طرف دیکھا اور بے قراری سے پوچھا۔

”کیا خبر ہے۔؟“

نوران نے ایک نظر مہنگے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”یہ کہتا ہے کہ چھوٹی بی بی آئی ہے۔؟“

”اس نے کہا تھا تو میں نے تجھے تسلی کے لیے بھیجا تھا۔“ شیردل نے کہا۔

”چھوٹے چوہدری صاب۔۔۔۔۔ اب مہنگے کو عینک بھی لگوا دیں۔ پتہ نہیں کس کو دیکھ آیا اور آ کر کہہ دیا کہ چھوٹی بی بی آئی ہے۔“ نوران نے اعتماد سے کہا۔

”تو کیا نہیں آئی۔؟ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اُسے۔“ مہنگے نے جھٹ اس کی طرف بڑھ کر تیز لہجے میں کہا۔

”ابھی میں اچار لینے کے بہانے گئی تھی۔ اس گھر میں دو کمرے ہیں۔ ایک کھانا بیڑہ ہے۔ مجھے کہیں چھوٹی بی بی نظر نہیں آئی۔“ نوران نے کہا۔

”اری میں نے خود دیکھا ہے۔“ مہنگا اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے بولا۔

”تو پھر وہ کہاں چلی گئی۔ اس گھر میں تو نہیں ہے۔ دادی تو چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ہی اچار ڈالا اور گھوم پھیر کر کمرے بھی دیکھ لئے۔“ نوران نے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

ہوا اور اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ممانے گھر سے نکال دیا کیا۔؟“  
 ”میرے ساتھ آؤ۔“ عاشر نے کہا۔  
 ”اندر بیٹھتے ہیں۔“ خاور نے پیشکش کی۔

”نہیں آ جاؤ۔“ عاشر نے کہا۔ خاور نے اپنی اُنکھی کے اشارے سے بتایا کہ وہ ایک منٹ میں آتا ہے۔ جب وہ بارہ نکلا تو اس نے جیکٹ پہن لی تھی۔ دونوں کا رتک آئے اور عاشر نے اسٹیرنگ سیٹ سنبھال لی۔ خاور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ کار اس محلے سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی۔ اس کی بریک پھر اسی جگہ لگی جہاں فرح کا فلیٹ تھا۔

خاور نے ایک نظر فلیٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”یہاں کیوں لے آئے ہو۔“

”تم نے ایک بات کہی تھی کہ جس کے لیے دل دھڑکتا ہے دراصل وہی تمہارے دل کا انتخاب ہوتا ہے۔“

”ہاں ایسا کہا تھا۔“ خاور نے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”تاویہ... عاصمہ اور فضیلہ کے لیے میرا دل نہیں دھڑکا.... جب میں نے فرح کا لکھا چند  
 سطروں کا وہ خط پڑھا اور اس خط کے ٹکڑے کر کے پھینکنے لگا تو میرا دل دھڑکا۔“ عاشر نے بتایا۔  
 ”تمہارا دل دھڑکا۔؟؟“ خاور نے خوش ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میرا دل دھڑکا۔ مجھے یکدم احساس ہوا کہ اس نے یہ سب کیوں واپس کر دیا ہے۔ اور وہ کہاں چلی گئی ہے۔ میں اس کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ میرے جسم میں جیسے بے قراری بھر گئی ہو۔“ عاشر نے کہا اور پھر خاور کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”ایسا کیوں میرے دوست.... ایسا کیوں ہوا اور ہو رہا ہے۔؟“

خاور نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنے دل سے نہیں پوچھا۔؟“

عاشق نے نگاہیں چرائیں۔ اور بولا۔ ”وہ تو کچھ اور ہی کہتا ہے۔“  
 ”کیا کہتا ہے۔؟“ خاور نے پوچھا۔

دھڑکن

”میں فرح سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک غریب لڑکی جس کے سر پر نہ ماں اور نہ باپ کا سایہ ہے۔ جانتے ہو اس نے یہ سب کیوں واپس کر دیا۔؟“ عاشر نے کہا۔  
”نہیں جانتا۔“ وہ بولا۔

”فرح کو پیسے اور چھت سے بڑھ کر کسی کا ساتھ چاہیے۔ کوئی مضبوط رشتہ۔۔ ایک سہارا۔۔۔ جس کے مل جانے سے اُسے زندگی بھر کا تحفظ مل سکے۔ جب میں اُسے چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔۔۔ یا۔۔۔ شاید کچھ سننا چاہتی تھی۔“ عاشر نے کہا۔  
”خاور۔۔۔ شاید میں فرح کو چاہنے لگا ہوں۔“

”شاید نہیں تم یقیناً اسے چاہنے لگے ہو۔“

”اچانک۔؟“

”محبت کا بیج کب دل کی زمین پر گرتا ہے اور کب اُسے پھول لگ جاتا ہے اس کا اچانک ہی پتہ چلتا ہے۔ میں نے تو یہ بہت پہلے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم فرح کو جانے نہیں دو گے۔ لیکن جب تم اسے چھوڑ آئے دس لاکھ کا چیک بھی دے دیا تو میں حیران تھا کہ تمہیں اس سے محبت کیوں نہیں ہو گئی۔ میرا دل کہتا تھا کہ تمہیں اس سے محبت ہو جانی چاہئے۔“ خاور نے کہا۔

”کیا میں نے دیر کر دی ہے۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”اب معلوم نہیں کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔“

”جہاں بھی گئی ہے میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے اپنے دل کی بات کرنا چاہتا ہوں۔“ عاشر نے مضطرب ہو کر کہا۔

”کاش ایسا پہلے ہو جاتا۔“ خاور نے کہا۔ ”تم چیک کی بجائے اپنا دل دیتے۔“

”کہتے ہیں دل والوں کے لیے دنیا بہت چھوٹی ہوتی ہے۔“

خاور مسکرایا۔ ”تو چلو اسے تلاش کرتے ہیں۔“

”لیکن کہاں۔؟“

”جہاں تک ہم جاسکتے ہیں۔“

”لیکن کیسے۔؟“

دھڑکن

”ایسے الفاظ اب تمہاری زبان پر نہیں آنے چاہئے۔“ خاور بولا۔ ”لیکن تم نے تو فیصلہ کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”وہ میرا فیصلہ تھا۔ میرے دل کی آواز نہیں تھی۔“ عاشر نے کہا۔

”مطلب کہ اب گھر میں ایک بار پھر ٹکراؤ ہوگا۔“ خاور نے کہا۔

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”سوچ لو۔۔۔ کھٹن راستہ ہے۔ فرح غریب اور لاوارث ہے۔ تم ایک محل میں رہنے والے شہزادے ہو۔“ خاور نے آزمانا چاہا۔

عاشر نے اس کی طرف دیکھا اور مصمم لہجے میں کہا۔ ”پہلی بار مجھے محبت ہوئی ہے۔ کسی کے لیے دل میں کوئی خوشگوار احساس جاگا ہے۔ اب کچھ بھی ہو جائے کوئی طوفان آجائے زمین پھٹ جائے راستے میں پہاڑ کھڑا ہو جائے فرح کو میں اپنا کر رہوں گا۔“

☆.....☆.....☆

فرح متغیر نگاہوں سے دادی اماں کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ دادی اماں نے اپنی آنکھیں چرا کر جانے کے لیے قدم اٹھایا تو فرح بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔

”کیا بات ہے دادی اماں۔۔۔ مجھے بتاؤ۔“ فرح نے پوچھا۔

”کیا بات ہے۔؟“ دادی اماں نے کہا۔

”میں نے ساری باتیں سن لی ہیں۔“ فرح نے کہا۔ ”دادی اماں مجھ سے کچھ مت

چھپاؤ۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔ مجھے کون اور کیوں تلاش کیا جا رہا ہے۔؟“

دادی اماں نے فرح کی طرف دیکھا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ اس کمرے میں لے گئی جہاں ایک بڑی چارپائی، ایک پیٹی اس کے اوپر تین ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے صندوق تھے۔

دادی اماں نے فرح کو اس چارپائی پر بیٹھا دیا اور خود اس کے برابر بیٹھ گئی۔ ”تجھ سے میں اب کچھ چھپا کر کیا کروں گی۔ لیکن چاہتی تھی کہ تو بغیر کچھ جانے یہاں سے چلی جائے۔ اور

شہر میں کہیں گم ہو جائے۔ فرح تو کیوں گاؤں میں آگئی۔ کس نے کہا تھا۔ شہر ہی رہتی۔ کہیں گم رہتی۔ جہاں شیردل کی نظر تجھ پر نہ جاتی۔“

”دل نے کہا کہ وہاں سے نکل جاؤں۔ اور میں یہاں آگئی۔ پر بات کیا ہے دادی اماں۔؟“ فرح نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ پریشان ہوگئی تھی۔

دادی اماں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”شیردل کا باپ الطاف تیرے باپ کے تایا کا بیٹا ہے۔ الطاف پانچ بھائی ہیں۔ پانچوں زمین دار ہیں۔ کچھ زمین انہیں باپ دادا سے ملی تھی۔ اور بہت سی انہوں نے دوسروں سے اپنی طاقت سے چھین لی۔ اور مالک بن بیٹھے۔ الطاف کے چھ بیٹے ہیں۔ چھ کے چھ بدمعاش ہیں۔ شیردل تم سے دس سال بڑا ہے۔ اس کی ایک بیوی ہے۔ چار بچے ہیں۔ لیکن اب وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”مجھ سے۔۔۔ کیوں۔؟؟“ فرح حیران ہو کر بولی۔

”کیونکہ تُو چھ برس کی تھی جب تیری شیردل سے منگنی ہوگئی تھی۔“ دادی اماں بولی

”میری منگنی۔؟“ یہ بات فرح کے لیے اور بھی حیرت کا باعث تھی۔

دادی اماں نے سر جھکا کر کچھ سوچا اور پھر کہا۔ ”یہ بھی ایک کہانی ہے۔ تجھے سناتی

ہوں۔ تُو بھی سن لے۔ اور جان لے کیا ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا۔“



فرح کے باپ کا نام فضل کریم تھا۔ اس نے اپنی محنت کے بل بوتے پر چودہ جماعتیں پڑھ لی تھیں۔ حالانکہ اس کا خاندان نہیں چاہتا تھا کہ وہ اتنا پڑھے۔ فضل کریم انتہائی شریف اور سادہ مزاج تھا۔ اس کے اندر کوئی چالاکی اور ہوشیاری نہیں تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ جبکہ اس کے تایا اور چاچا کی کافی اولادیں تھیں۔

فضل کریم کے باپ کی اس گاؤں میں زمین تھی مال ڈنگر تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کا بیٹا پڑھ لکھ گیا ہے وہ کھیتی باڑی کو بہت اچھے طریقے سے کرے گا۔ خود فضل کریم بھی ایسا ہی کرنا چاہتا تھا کہ اس کا باپ اچانک فوت ہو گیا۔

فضل کریم نے اپنی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ اس کی ماں نے اس کی شادی ساتھ والے گاؤں میں کر دی تھی جو امیر گھر نہیں تھا۔ ان کی پہلی اولاد فرح کی صورت میں ان کے گھر کے آنگن میں آئی تھی۔

فرح چھ سال کی ہوگئی تھی۔

فضل کریم کے تایا اور چاچا زاد کی خواہش تھی کہ کسی بھی طرح سے اس کی جو زمین ہے وہ ہتھیالیں۔ ایک اکیلا فضل کریم ہی تو تھا کمزور اور لاغر جو نہ کسی سے لڑ سکتا تھا اور نہ جھگڑنے کی ہمت رکھتا تھا۔

رشتے دار اپنی اپنی کوشش میں تھے۔ کہ ایک دن چوہدری الطاف نے اپنی حویلی کے



دھڑکن

احاطے میں فضل کریم کو بھی بلا لیا۔ پہلے تو کباب روٹی ہوتی رہی۔ اس کے بعد بندوق پکڑ کر اڑتی ہوئی چڑیا کا نشانہ سب نے باری باری لینا شروع کر دیا۔ اور یکدم چوہدری الطاف نے بندوق فضل کریم کی طرف بڑھادی اور بولا۔ ”آج فضل کا نشانہ بھی دیکھتے ہیں۔ لے فضل تو وہ سامنے جو دیوار پر ہانڈی رکھی ہوئی ہے اس کا نشانہ لے۔ نشانہ ٹھیک لگا تو تجھے انعام دوں گا۔“

”میں۔“ فضل کریم نے بندوق کو دیکھتے ہی حیرانی کا اظہار کیا۔ ”میں نے کبھی غلیل سے کسی چڑی کا نشانہ نہیں لیا اور آپ بندوق سے کہہ رہے ہیں۔“

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ آج بندوق پکڑ اور اڑا دے وہ ہانڈی۔“ چوہدری الطاف نے ہنس کر کہا۔

”نہیں نہیں مجھ سے نہیں ہوگا۔“ فضل کریم نے صاف انکار کر دیا۔

”کیا نہیں ہو سکتا۔ پکڑ تو سہی۔“ الطاف نے زبردستی بندوق اس کے ہاتھ میں دے

دی۔

فضل کریم نے پہلی بار بندوق اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ اس نے بندوق کو غور سے دیکھا اور پھر الطاف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“

”تو تو یا کسی عورت سے بھی کمزور دل ہے۔“ الطاف کے ملازم ریہو نے ہنس کر کہا اور

سب ہنس پڑے۔

شیردل اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور بولا۔ ”ملازم کی کہی بات کو اب غلط کرنا پڑے گا۔ دیکھ فضل یہ ہمارے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ نشانہ لے کر ثابت کر دے کہ ہمارے خاندان کے مرد مرد ہی ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے گولی چلانی ہی نہیں آتی۔“ فضل کریم نے سادگی سے کہا۔

”چھوڑیں چوہدری صاحب۔ فضل کو سویرے سویرے مدانی دے دیا کریں۔ چائی میں

ڈال کر گرگڑتا رہے اور تسی بناتا رہے۔“ ملازم نے پھر کہا اور سب اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔

”دیکھ فضل اب انکار مت کرنا اور جیسا بھی ہے اس ہانڈی کا نشانہ لے۔“ شیردل نے

کہا۔ اور اس کا رخ دیوار پر پڑی ہانڈی کی طرف کر دیا۔ ”فضل نشانہ لے گا۔“

دھڑکن

کچھ فاصلے پر دیوار تھی جس پر اُلٹی کر کے ہنڈیا رکھی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے دیوار کے ساتھ شیردل کی پسندیدہ سفید اعلیٰ نسل کی گھوڑی باندھی ہوئی تھی۔

ناچا ہتے ہوئے بھی فضل کریم نے بندوق سیدھی کی اور ہانڈی کا نشانہ باندھ لیا۔ سب ہی اس کے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد فضل کریم نے بندوق نیچے کر لی اور شیردل سے بولا۔

”میں نشانہ نہیں لے سکتا۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔“

”اب تو تجھے کرنا ہی ہوگا۔ تمہاری جگہ میں نے ہاں کی ہے۔“ شیردل نے کہا۔

”شیردل ضد نہ کر۔“ فضل نے کہا۔

”ضد تو کر رہا ہے۔ لگا نشانہ۔“ شیردل نے کہا۔

”نہیں... نہیں۔“ فضل نے پھر نفی میں گردن ہلائی۔

”اب تمہارے منہ سے انکار نہ نکلے۔“ شیردل نے کہا۔

”جانے دیں چوہدری صاحب اس سے نہیں ہوگا۔“ ملازم بولا۔

”ہوگا کیوں نہیں ہوگا۔ لگا نشانہ فضل۔“ شیردل نے ایک بار پھر مجبور کیا اور فضل کریم نے

بندوق ایک بار پھر سیدھی کر لی اور نشانہ باندھنے لگا۔

سب کی نگاہیں سامنے تھیں جبکہ چوہدری الطاف اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ فضل کریم کے ہاتھ کاپنے لگے تھے۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ اچانک گولی چلی آس پاس درختوں پر بیٹھے پرندے یکدم اڑے سب نے دیکھا کہ گولی ہانڈی کو نہیں لگی تھی، نشانہ سیدھا شیردل کی سفید گھوڑی کو جا لگا تھا۔ خون میں لت پت سفید گھوڑی تڑپی اور پھر ٹھنڈی ہو گئی۔ فضل کریم کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ گئی تھی۔ سب گھوڑی کی طرف بھاگے۔ شیردل سب سے آگے تھا۔ فضل کریم دم بخود کھڑا تھا۔ اور اس کے پیچھے چوہدری الطاف بڑے اطمینان سے زیر لب مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنی چال میں کامیاب ہو گیا تھا۔

شیردل کی پسندیدہ گھوڑی مر گئی تھی۔ اس نے پاس ہی پڑا ایک موٹا پانچ فٹ کا سریا پھرا اور اسے مارنے کے لیے فضل کریم کی طرف بڑھا۔ جب فضل کریم نے یہ دیکھا تو وہ خوف کے

مارے چوہدری الطاف کے پیچھے ہو گیا۔ چوہدری الطاف نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا، انہوں نے شیردل کو پکڑ لیا۔

شیردل غصے میں اندھا ہو گیا تھا۔ اس کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ بول رہا تھا۔ چوہدری الطاف کے آدمیوں نے اسے پکڑا ہوا تھا۔ فضل کریم ڈرا سہا چوہدری الطاف کے پیچھے کھڑا تھا۔ چوہدری الطاف نے آگے بڑھ کر شیردل کے غصے کو سمجھا کر ٹھنڈا کیا اور پھر دونوں کو اندر لے گیا۔ چوہدری الطاف کے دونوں خاص آدمی اور مہنگا بھی ان کے ساتھ تھے۔

”شیردل۔۔۔ اپنے آپ کو سنبھالو اور میری بات غور سے سنو۔“ چوہدری الطاف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری گھوڑی اس نے مار دی ہے۔ جانتے ہیں وہ کتنی قیمتی تھی۔ اور مجھے کتنی پیاری تھی۔“ شیردل بولا۔

”میں نے جان بوجھ کر نہیں ماری۔“ فضل کریم نے گھبراہٹ سے بھری آواز میں کہا۔

”مجھے میری گھوڑی چاہیئے۔ ابھی اور اسی وقت مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔“ وہ چیخا۔

”شیردل تو جانتا ہے کہ وہ اب مر گئی ہے۔“ چوہدری الطاف نے کہا۔

”میں ایسی ہی گھوڑی خرید دیتا ہوں۔“ لاچار فضل کریم نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔

”ایسی نسل کی گھوڑی کہاں سے لائے گا تو۔؟“ چوہدری الطاف نے اس کی طرف

دیکھا۔ ”یہ بڑی نایاب نسل کی گھوڑی تھی فضل۔“

”میرا تصور بھی تو نہیں ہے۔“

”گولی تو تو نے ہی چلائی ہے ناں۔“ مہنگے نے کہا۔

”میں نے گولی گھوڑی پہ تو نہیں چلائی تھی۔“

”تو پھر جان کے بدلے جان دینے کے لیے تیار ہو جا۔ میں اسے نہیں چھوڑوں

گا۔“ شیردل یکدم بجلی سی تیزی سے آگے بڑھا اور سامنے دیوار پر لٹکی بندوق اٹھا کر فضل کریم پر

تان لی۔ کوئی بھی آگے پیچھے نہ ہوا۔ فضل کریم اس کی بندوق کی زد میں تھا۔ وہ ڈر گیا اور اس قدر

خوفزدہ ہوا کہ اس نے چیخ کر کہا۔

”مجھے مت مارو۔ میں اس کے بدلے میں کچھ بھی دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں کچھ بھی

کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے مت مارو۔ خدا کے لیے مجھے مت مارو۔“

تب چوہدری الطاف نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے پھر شیردل کو پکڑ

لیا۔ اسے سمجھایا اور کرسی پر بیٹھا دیا۔ پھر انہوں نے فضل کریم کو بھی پاس ہی بیٹھا لیا۔

”دیکھ فضل۔۔۔ جو ہوا وہ تو ہو گیا۔ شیردل کی وہ پیاری گھوڑی تھی۔ نایاب گھوڑی اس

نے کیسے لی تھی یہ ہم جانتے ہیں۔ اس کی عادت سے بھی تو واقف ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ سارا

پنڈ ہمیں آپس میں لڑتا مرنے دیکھے۔ بتا کیا کرنا ہے۔؟“ چوہدری الطاف نے کہا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ فضل کریم نے سر جھکائے کھڑا۔

”ایسی گھوڑی تو کہیں سے لا نہیں سکتا ہے۔ اور شیردل اس معاملے میں شیر ہے۔ کچھ بھی

کردے گا۔“ پھر وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ ”میں فیصلہ کروں تو منظور کرے گا۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ فضل کریم نے کہا۔ وہ بدستور گھبرایا ہوا تھا۔ وہ تو اپنی

جان چھڑانا چاہتا تھا۔ دل اس کا خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ شیردل کی فطرت سے وہ

بخوبی واقف تھا۔ اور ابھی اس کے دوسرے بھائی یہاں نہیں آئے تھے۔ وہ ہوتے تو جانے کیا

ہو جاتا۔

”زمین پیسہ ہمارے پاس بہت ہے۔ اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ تو شیردل کو اپنا

داماد مان لے۔“ چوہدری الطاف نے کہا۔ فضل کریم نے اس کی بات سنی تو یکدم اس کی طرف

دیکھا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے اس نے کہا۔

”وہ چھ سال کی ہے۔۔۔۔۔“

”آج ہم آپس میں ہاں کر کے منگنی کر دیں گے۔ نکاح اور رخصتی جب وہ بیس سال کی

ہو جائے گی تب ہوگی۔ کسی رشتے دار کو کانوں خبر بھی نہیں ہوگی۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ کانپتے بدن کے ساتھ فضل نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن ویکن کرے گا تو پھر تو جان اور شیردل جانے۔ میں بیچ میں نہیں آؤں

گا۔“چوہدری الطاف نے اس کے بولنے کا راستہ بند کرتے ہوئے کہا۔ فضل کریم اس کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔

چوہدری الطاف نے فضل کریم کی ماں اور اس کی بیوی کو بھی اپنی حویلی میں بلا لیا تھا۔ انہیں اس نے سارا واقعہ سنانے کے بعد اگلی کہانی یہ سنائی تھی کہ فضل کریم نے جان کے بدلے فرح کا رشتہ دے دیا ہے۔ سب حیران تھے۔ اور پھر چھ سال کی فرح کی منگنی اس سے دس سال بڑے شیردل سے اسی وقت کردی۔ کوئی کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔ بولتا بھی کیسے جو بھی ہو رہا تھا خوف کے سائے میں ہو رہا تھا۔ شیردل کے سارے بھائی وہاں موجود تھے اور ایک بکری کے بچے کی طرح فضل بے بس اور لاچار تھا۔

جب منگنی ہوگئی تو الطاف نے فضل کریم سے کہا۔ ”یاد رکھنا اگر تم نے اس کی شادی کہیں اور کرنے کی کوشش کی تو ہم اپنی منگ کے بدلے میں تم تینوں کو گولیوں سے بھون دیں گے۔“ اور ایک سادھے کاغذ پر اس کے دستخط بھی کرا لئے۔

چند دن کے بعد چوہدری الطاف نے اسے مشورہ دیا کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ اس گاؤں میں بیٹھ کر کھیتی باڑی کرنا اس کے بس کا کام نہیں ہے، نئے شہر چلا جا۔

فضل کریم نے سوچا کہ ممکن ہے کہ وہ اس طرح سے شہر کی بھیڑ میں گم ہو جائے۔ فضل کریم اپنی بیوی اور فرح کو لے کر شہر چلا گیا۔ وہاں اس نے نوکری کر لی۔ لیکن وہ چوہدری الطاف اور اس کے بیٹوں کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکا۔ گاؤں کے پٹواری سے مل کر فضل کریم کی زمین چوہدری الطاف نے اپنے نام لگا لی تھی۔ شاطر الطاف اگر اس وقت زمین مانگ بیٹا تو فرح اس کے بیٹے کو نہ ملتی۔ زمین جیسے اس نے لینی تھی وہ لے لی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ فرح بڑی ہو گئی۔ شیر دل نے گاؤں میں بھی شادی کر لی تھی۔ اور پھر ایک حادثے میں فرح کے ماں باپ اس دنیا میں نہیں رہے۔

جب فرح اپنی خالہ کے پاس رہتی تھی تو بھی وہ ان کی نگاہ میں تھی۔ شیردل کا کہنا تھا کہ بھی فرح شہر کی ہوا کھا لے۔ اور جب شیردل کا ارادہ بنا کہ وہ اب فرح سے شادی کر لے تو فرح اچانک شہر میں کہیں گم ہو گئی۔ اس نے اس کی تلاش کی، دادی اماں نے بھی اس وقت فرح

وہتر کی

کو پیغام بھجوانے کی کوشش کی کہ وہ کہیں بھی چلی جائے لیکن اس گاؤں کا رخ نہ کرے لیکن وہ پیغام بھی اسے نہ مل سکا اور قسمت کا چکر کہ فرج گاؤں آگئی۔

☆.....☆.....☆

فرح حیران پریشان اس حقیقت کو سن رہی تھی جو دادی اماں بیان کر رہی تھی۔ پھر دادی اماں نے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ وہ لوگ تم تک پہنچیں، تجھے راتوں رات یہ گائوں چھوڑ کر جانا ہوگا۔ شہر کی بھیڑ میں گم ہونے کیلئے۔“

☆.....☆.....☆

دروازے پر ہلکی دستک سے فیاض احمد کے ٹائی باندھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ہیں۔“

دروازہ کھلا اور معاشر کا چہرہ نمودار ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی فیاض احمد نے خوش ہو کر کہا۔ ”آؤ بیگ بین۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔“

”مما کہاں ہے۔؟“ عائشہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی ممانے کوئی کام ہے کہ مجھ سے کوئی بات کرنے سے پہلے پوچھ رہے ہو۔“ فیاض احمد نے اپنی ٹائی کی ناٹ آئینے میں دیکھتے ہوئے اُسے ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”دونوں سے بات کرنی ہے۔“ عاشق نے کہا۔

”خیریت تو ہے۔؟“ فیاض احمد نے پوچھا۔

”ہاں خیریت ہے۔“ عاشق نے کہا۔

”تمہاری ماما کمرے سے باہر نکلی تھی۔ تم ایسا کرو پہلے مجھ سے بات کر لو۔ تاکہ اگر بات گزر بڑوالی ہوئی تو میں سنبھال لوں گا۔“ فیاض احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وڈیڈ آپ بھی بس سنسر بورڈ کی طرح بن جاتے ہیں۔؟“ عاشق مسکرایا۔

”تمہاری ماما کے موڈ کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے کہہ رہا ہوں۔“ فیاض احمد نے ایک آنکھ

دبا کر کہا اور اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور چائے کا ایک کپ پکڑے نگہت بیگم اندر آ گئی۔ وہ عاشق کو دیکھتے ہی بولی۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں۔؟“

”کوئی خاص نہیں بس ایسے ہی۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”کیا بات ہے عاشق چہرے سے تو بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے ہو۔“ نگہت بیگم ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اب یہ ذمہ دار ہو گیا ہے۔ سنجیدہ تو ہو گا ہی۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”مما ایک بات کرنی تھی۔“ عاشق اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

”ہاں کرو کیا بات ہے۔“ نگہت بیگم نے ایک گھونٹ چائے کا لیا۔

عاشق نے کچھ سوچا اور پھر فیاض احمد کا بازو پکڑ کر ساتھ والی کرسی پر بیٹھا دیا۔ اور خود ان کے سامنے چھوٹی تپائی کورکھ کر بیٹھ گیا۔

”لگتا ہے کوئی اہم بات ہے۔“ فیاض احمد نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”عاشق نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔“ بات یہ ہے ممما۔۔۔۔۔“

اس کے رکتے ہی نگہت بیگم نے کہا۔”ہاں ہاں بتاؤ کیا بات ہے۔“

”آپ ابھی فیصلہ کی ان کے گھر والوں سے بات نہ کریں۔ ابھی نہیں بلکہ کبھی نہیں۔“ عاشق نے کہا۔ اس کی بات سن کر نگہت بیگم تو چونکی ہی تھی فیاض احمد بھی اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔

”کیوں کیا ہوا۔؟“ نگہت بیگم نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ساتھ پڑے میز پر رکھ

دیا۔

”میں فیصلہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ عاشق نے صاف کہہ دیا۔

”کیوں۔؟“ نگہت بیگم متحیر ہو کر بولی۔ فیاض احمد اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا

”کیونکہ۔۔۔ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ عاشق نے کہا۔

”کوئی توجہ ہوگی۔؟“ نگہت بیگم نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جمادیں۔

”بیٹا تم نے ہی فیصلہ کو اپنے لئے منتخب کیا تھا۔“ فیاض احمد اپنا گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں لیکن میں نے سوچا کہ وہ فیصلہ میرا ٹھیک نہیں تھا۔“ عاشق نے کہا۔

”تو تمہارا کیا فیصلہ ٹھیک ہے۔؟“ نگہت بیگم کو غصہ آنے لگا تھا۔

”میں فرح سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عاشق نے بلاتامل کہا۔

فیاض احمد تو یکدم چونک پڑا اور نگہت بیگم نے دانت پیس کر بڑی حیرت سے اس کا نام لیا۔ ”فرح۔؟؟“

”ہاں وہی جو میرے ساتھ اس گھر میں آئی تھی۔“

”وہ لاوارث غریب لڑکی۔“ نگہت بیگم نے نفرت سے کہا۔

”لاوارث ہے غریب ہے تو کیا ہے۔ اس دنیا کا ایک حصہ ہے۔ انسان ہے پڑھی لکھی

ہے۔ اچھی لڑکی ہے۔“ عاشق نے کہا۔

”شٹ آپ۔“ نگہت بیگم نے فوراً ڈانٹ دیا۔ ”شٹ آپ جو آئندہ تم نے اس کے

بارے میں ذکر میرے سامنے کیا یا اس گھر میں بھی بات کی۔“

”ایم سوری ممما۔۔۔ میں فرح کے لئے سنجیدہ ہوں۔“ عاشق نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”تم اس لڑکی کے لئے سنجیدہ ہو جس کے خاندان کا آتہ پتہ نہیں ہے۔ اس جیسی ہماری

ملازما میں ہیں اور تم۔۔۔۔۔“ نگہت بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔

”پلیز ممما۔۔۔ میں نے فیصلہ کیا ہے اور میں اُسے تلاش کروں گا اور اُسی سے شادی

کروں گا۔“ عاشق نے نگہت بیگم کی بات کاٹ کر کہا۔

”تلاش کرو گے۔؟ کیا مطلب۔؟“ فیاض احمد نے فوراً پوچھا۔

”وہ اچانک کہیں چلی گئی ہے۔ اس کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ فرح سے

اچھی لڑکی میری زندگی میں نہیں آ سکتی ہے۔“ عاشق نے بتاتے ہوئے کہا۔

نگہت بیگم نے تمسخرانہ مسکراہٹ چھوڑ کر کہا۔ ”اچھی لڑکی۔؟؟ سن رہے ہیں آپ جو پیسے

پیسے کی محتاج ہے اور پیسے کے لئے تمہاری جعلی بیوی بننے کے لئے تیار ہو گئی وہ اچھی لڑکی ہے۔؟“

عاشق اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں نے فرح کو اس ڈرامے کے عوض ایک فلیٹ اور دس لاکھ روپے



دیئے تھے۔ میری نیت تھی کہ وہ اس دنیا میں اکیلی ہے۔ بے سہارا ہے۔ اسے اس بہانے رہنے کے لئے چھت مل جائے گی۔ زندگی گزارنے کے لئے کچھ کرنے کے لئے پیسہ مل جائے گا۔ لیکن ڈیڈ اس نے وہ فلیٹ اور دس لاکھ روپے کا چیک مجھے واپس کر دیا۔“ عاشر نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”مجبوری کے کشکول میں گرا ہوا ایک پیسہ کتنی اہمیت رکھتا ہے یہ کوئی اس سے پوچھے جس کے ہاتھ میں کشکول اور گلے میں ضرورتوں کا طوق ہو۔ ہوتا تو یہ کہ وہ ایک فلیٹ اور دس لاکھ روپے لے کر خوش ہو جاتی۔ اسے اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ لیکن وہ ایک خاندانی لڑکی ہے۔ پیسہ اور خالی چھت اس کی اہمیت نہیں ہے۔“

فیاض احمد انہماک سے اس کی بات سن رہا تھا۔ نگہت بیگم نے کہا۔ ”تم نادان ہو۔ ایسی لڑکیاں بڑے لوگوں کو پھنسانے کے لئے کون کونسا دار کرتی ہیں تم نہیں جانتے ہو۔“

”وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“

”عاشر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ ایسی نہیں ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”فیاض احمد۔“ نگہت بیگم نے گھور کر فیاض احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ”نگہت بیگم سوچو... ہمارے خاندان کی کتنی لڑکیاں ہیں جو پیسے کے پیچھے نہیں بھاگ رہی ہیں۔ سب کچھ ہونے کے باوجود کسی نے اپنا بوتیک کھولا ہوا ہے کوئی فیشن میں گھسی ہوئی ہے کوئی کچھ کاروبار کر رہی ہے۔ اور فرح کو ایک گھر چاہئے خالی چھت نہیں۔“

”فیاض احمد... ہم لوگوں کے پاس پیسہ ہے۔ ہم پیسے سے پیسہ کمانا جانتے ہیں۔“ نگہت بیگم نے دلیل پیش کی۔

”مما۔۔۔ میں نے اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ میں فرح سے ہی شادی کروں گا۔“ عاشر نے ایک بار پھر کہا اور جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔

نگہت بیگم اپنی جگہ سے اٹھی اور تیخ پا ہو کر بولی۔ ”سن لو عاشر۔۔۔ میری زندگی میں وہ اس گھر میں میری بہو کے روپ میں نہیں آئے گی۔“

عاشر نے نگہت بیگم کی بات سنی اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ فیاض احمد بند دروازے کی

☆.....☆.....☆

عاشر اپنے فیصلے پر قائم تھا۔ اس نے وہ الفاظ واپس لینے کے لئے کہے ہی نہیں تھے۔ اس کا دل مطمئن تھا۔ اور اب وہ جلد از جلد فرح کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کہاں تلاش کرے اور کیسے تلاش کرے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

خاور کو اپنے ساتھ لئے وہ شام تک اسے اپنی کار میں بیٹھائے شہر میں گھومتا رہا تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور پھر وہاں سے تیسری جگہ۔۔۔ فرح کا چہرہ اسے ہر جگہ دکھائی تو دیتا تھا لیکن حقیقت میں وہ کہیں نہیں تھا۔ خاور چپ تھا۔ عاشر کا جس طرف دل چاہتا تھا وہ اپنی کار کا رخ اسی طرف کر لیتا تھا۔ تھک کر وہ خاور کو اس کے گھراتارنے کے لئے چلا گیا۔

دونوں کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خاموشی خلیج بنی ہوئی تھی۔ عاشر سامنے دیکھ رہا تھا اور خاور کے چہرے کا رخ دوسری طرف تھا۔

”تمہارا گھر آ گیا ہے۔“ عاشر نے کہہ کر خاموشی توڑی۔

”ہم دونوں کی دوستی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔؟“ خاور نے پوچھا۔

”تم کیوں پوچھ رہے ہو۔؟“ عاشر نے کہا۔

”میں نے پہلی بار تمہیں ایک لڑکی کے لئے اتنا سیریس دیکھا ہے۔ میں چپ تمہارے

ساتھ بیٹھا رہا اور دیکھتا رہا کہ تم کیا کرتے ہو۔ کہاں کہاں جاتے ہو۔ واقعی تمہیں اس سے پیار ہو گیا ہے۔ تم اسے چاہنے لگے ہو۔“ خاور نے کہا۔

”مجھے لگتا ہے کہ دیر ہو گئی ہے۔“ عاشر نے کہا۔

”ہم اُسے اس شہر میں کیسے تلاش کریں گے۔ ایک خالہ اور خالو تھے انہوں نے اسے

پہلے ہی گھر سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا تھا۔ کوئی اور عزیز رشتہ دار ہے نہیں کہ اس کا وہاں سے پتہ لگ سکے۔“ خاور نے کہا۔

”کیا کریں۔؟؟“

”ایک کام کرتے ہیں۔ میں شگفتہ سے اس کی خالہ اور خالو کے گھر کا پتہ لیتا ہوں۔ ایک کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ شاید اس کا کوئی سمجھوتہ ہو گیا ہو اور فرح پھر سے اسی گھر میں چلی گئی ہو۔“ خاور نے خیال پیش کیا۔

”اچھا خیال ہے۔“ عاشر نے تائید کی۔

خاور نے اپنے موبائل فون سے شگفتہ کو فون کیا اور اس سے فرح کی خالہ کا پتہ معلوم کر لیا۔

☆.....☆.....☆

شگفتہ کے بتائے ہوئے پتے پر دونوں پہنچ گئے۔ خاور نے دروازہ بجایا تو کچھ دیر بعد خالو کا چہرہ نمودار ہو گیا۔

”جی فرمائیے۔“ خالو نے دونوں کا باری باری جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہمیں شرف الدین صاحب سے ملنا ہے۔“ خاور نے کہا۔

”فرمائیے میں ہی شرف الدین ہوں۔“ خالو نے کہا۔

”جی میرا نام خاور ہے اور یہ عاشر ہے۔ جس کمپنی میں فرح جاب کرتی ہے ہم اسی کمپنی سے آئے ہیں۔ چند دنوں سے مس فرح کام پر نہیں آ رہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی نہیں بتائی۔ کیا آپ ہمیں مس فرح سے ملوا سکتے ہیں تاکہ ہم وجہ جان سکیں۔“ خاور نے کہا۔

”آپ اس کمپنی سے آئے ہیں جس میں فرح جنرل مینجر لگ گئی تھی۔ اسے رہنے کے لئے گھر اور چلانے کے لئے کار بھی مل گئی تھی۔“ خالو نے یکدم خوش ہو کر پوچھا۔

اس کی بات سن کر خاور نے عاشر کی طرف دیکھا اور عاشر نے اس کی طرف۔ دونوں کو یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ عاشر نے آگے ہو کر کہا۔

”جس کمپنی میں انہیں جنرل مینجر کا عہدہ مل گیا تھا بھلا اس نے کیا نام لیا تھا اس کمپنی کا۔؟“

”نام نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا ہی بتایا تھا۔ اور کہا تھا کہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے تنخواہ لگ

گئی ہے۔“ خالو نے کہا۔ اور زبان ہونٹوں پر پھیری۔

”یہ کب کی بات ہے۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”یہی کوئی دس پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔“ خالو نے کہا۔

عاشر اور خاور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور انہیں ساری بات کی سمجھ آ گئی تھی کہ

فرح نے یہاں سے جاتے ہوئے انہیں ایسی ہی کوئی کہانی سنائی ہوگی۔ خاور نے کہا۔ ”تو کیا

مس فرح سے ملاقات ہو سکتی ہے۔؟“

”وہ تو اسی دن چلی گئی تھی۔ کس کمپنی میں گئی ہے کہاں رہائش ملی ہے ہمیں اس نے بتایا ہی

نہیں تھا۔ اس لئے میں کچھ نہیں جانتا۔“ خالو نے کہا۔

”اس دن کے بعد پھر آپ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔؟“ عاشر نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ خالو نے نفی میں گردن ہلائی۔

عاشر اور خاور ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اجازت لے کر وہاں سے چل

پڑے۔

☆.....☆.....☆

”اب کیا کریں؟“ کار چلاتے ہوئے عاشر نے پوچھا۔

”وہی جو میں اکثر کہتا ہوں۔“

”کیا کہتے ہو۔؟“

”اپنی کشتی خدا کے سہارے چھوڑ دو۔ کوئی کنارہ مل جائے گا دل میں کوئی ایسی دستک

ہو جائے گی کہ جس سے یہ پتہ چل جائے کہ مس فرح کہاں ہے۔“ خاور نے کہا۔

”مجھے لگتا ہے کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر یہ بھی کوئی دستک ہے۔“ خاور نے فلاسفر کے انداز میں کہا۔

”لیکن وہ کس شہر میں اور کہاں گئی ہوگی اس کا پتہ کیسے چلے گا۔“ عاشر نے تشویش بھری

نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہاری لگن سچی ہے میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اس کا اچھا نتیجہ تو نکلے گا۔“ خاور نے

پر اعتماد لہجے میں کہا۔

کار پھر خاور کے محلے میں پہنچ گئی تھی۔ خاور وہاں اتر گیا۔ عاشر نے کار کا رخ اپنے گھر کی طرف کر دیا۔ اچانک اس نے بریک لگائی اور کار پیچھے کی طرف گھمادی۔ وہ اس عمارت کے سامنے آ گیا تھا جہاں اس نے فرح کو فلیٹ دیا تھا۔ عاشر نے کار کے ڈیش بورڈ سے فلیٹ کی چابی نکالی اور اوپر چلا گیا۔

فلیٹ کا دروازہ کھولا تو وہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ عاشر نے فلیٹ روشن کر دیا۔ ایک نظر ہر طرف دوڑائی سب کچھ اپنی جگہ پر تھا۔ فرح میں کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا۔ عاشر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا اور غور سے دیکھتا اور باہر نکل آتا تھا۔ نشست گاہ میں پہنچ کر اس نے پھر ایک جائزہ لیا۔ اور واپس جانے کے لئے جیسے ہی دروازے کے پاس پہنچا لائٹ بند کرنے کے لئے اس نے بٹن دبایا ایک بار پھر فلیٹ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ یکدم عاشر چونکا اور اس نے تیزی سے بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ اس کی نگاہیں اس سوئچ بورڈ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

عاشر نے جلدی سے اپنی جیب سے پنسل اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا سوئچ بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے لکھا۔ پھر غور سے پڑھا۔ اس کے چہرے پر ایک اطمینان سا آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ فرح نے یہ یقیناً اسی کے لئے کیا ہوگا۔ فرح نے سفید سوئچ بورڈ کی شیٹ پر اپنے ہاتھ سے اپنے گاؤں کا پتہ لکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

آفتاب نے اپنے بزنس کے لئے ایک پلازے میں آفس لے لیا تھا۔ وہ ہال نما جگہ تھی۔ اس کے اسٹاف کے بیٹھنے کی جگہ اور اس کا اپنا کیبن بڑی تیزی سے مکمل ہو گیا تھا۔ دن رات وہ اپنا بزنس شروع کرنے کے لئے مصروف تھا۔ جن لوگوں کے ساتھ اس نے بزنس کرنا تھا ان کے ساتھ بھی اس کے رابطے تھے۔ اس کے پاس تین موبائل فون تھے اور تینوں موبائل

میں سے کوئی نہ کوئی موبائل فون مصروف ہی رہتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے ایک موبائل فون پر کراچی کی ایک کمپنی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ جبکہ دوسرے موبائل فون پر صبا کا فون آ رہا تھا۔ اتفاق سے ایسا یہ تیسری بار ہو رہا تھا۔ اس سے قبل بھی جب صبا کا فون آیا تھا تو آفتاب کو صبا کا فون کا ٹنا پڑا تھا۔ اور بعد میں وہ اسے فون نہیں کر سکا تھا۔

اس وقت بھی وہ بات کرنے میں مصروف تھا اور صبا کا فون بار بار آ رہا تھا۔ مجبوراً آفتاب کو اس کا فون کا ٹنا پڑ رہا تھا۔ وہاں بات ختم ہوئی تو دوسرے فون پر ایک اور پارٹی سے بات شروع ہو گئی تھی۔ اور اس طرح اس مرتبہ بھی وہ صبا کو فون نہیں کر سکا۔

بشیر جیلانی کچھ کاغذات لے آیا تھا۔ آفتاب ان کاغذات کو دیکھنے لگا تھا۔ یکدم آفتاب کے کیبن کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ آفتاب اور بشیر جیلانی نے فوری اس طرف دیکھا۔ سامنے صبا کھڑی تھی۔

اس کے چہرے پر وہی تمکنت اور غصے کی ہلکی سرخی عیاں تھی۔ آفتاب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے صبا آؤ۔ کم آن۔“

صبا اس کے پاس آ کر بولی۔ ”تم مصروف ہو۔؟“

”نہیں بس ایسے ہی۔“

”میں پھر آ جاتی ہوں۔“

”نہیں... نہیں یہ کام ضروری نہیں ہے۔“ آفتاب نے کہا اور بشیر جیلانی سے بولا۔ ”ہم کل اس پر ڈسکس کریں گے۔“

”اوکے۔“ بشیر جیلانی نے کہا اور کاغذات سمیٹ کر چلا گیا۔

”بیٹھو۔“ آفتاب نے صبا سے کہا۔

”میرا فون بار بار کیوں کاٹ رہے تھے۔؟“ صبا نے پوچھا۔

”جب بھی تمہارا فون آتا تھا میں دوسرے فون پر کسی سے بات کر رہا ہوتا تھا اس لئے مجھے کا ٹنا پڑتا تھا۔“ آفتاب نے کہا۔

”میرا فون کاٹنے سے پہلے تم اس کا فون کیوں نہیں کاٹ دیتے جس تمہاری بات ہو رہی ہوتی تھی۔“ صبا نے کہا۔

”صبا میری کوئی بزنس ڈیل ہو رہی ہوتی تھی۔ میں وہ فون کیسے کاٹ سکتا ہوں۔“ آفتاب نے کہا۔

”مجھ سے زیادہ اب بزنس اہم ہو گیا ہے۔“

”تم اپنی جگہ ہو اور بزنس اپنی جگہ ہے۔“

”لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ تم میرے فون پر کسی اور کے فون کو اہمیت دو۔“ صبا نے تمکنت سے کہا۔

”چھوڑو اس بات کو۔“ آفتاب نے بات ختم کرنے کے لئے کہا۔

صبا نے اس دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ابھی بشیر جیلانی باہر گیا تھا تو اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص تمہارے ساتھ تمہاری کمپنی میں کام کرے گا۔؟“

”کون شخص۔؟“ آفتاب نے پوچھا۔

”میں مسٹر بشیر جیلانی کی بات کر رہی ہوں۔“

آفتاب مسکرایا۔ ”وہ کوئی ایسا شخص نہیں ہیں۔ وہ میرے ابو کے دوست تھے اور میں انہیں چاہا جی کہتا ہوں۔ وہ میری کمپنی میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں۔“

”کوئی ریڑھ کی ہڈی کی طرح نہیں ہوتا۔ مارکیٹ میں اس سے بھی ذہین لوگ کام کر رہے ہیں۔ چند ہزار کا اضافہ کر کے سیلری بتاؤ تو وہ دوڑتے ہوئے آ جاتے ہیں۔“ صبا نے کہا۔

”خیر ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔“ آفتاب کو صبا کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”ہمیں اس بات سے لینا دینا ہے تو میں نے یہ بات کی ہے۔ تم اس بوڑھے کو فارغ کیوں نہیں کر دیتے ہو۔“ صبا نے کہا۔

آفتاب نے صبا کی طرف دیکھا اور بشیر جیلانی کو اس طرح سے مخاطب کرنے پر وہ صبا کو

کچھ کہنے کی بجائے بولا۔ ”جب وقت آئے گا تو دیکھ لیں گے۔“

”آفتاب تم نے وقت کسی سے لینے کے لئے جانا ہے۔ تم اس کمپنی کے مالک ہو۔ کبھی بھی کسی بھی وقت تم کوئی بھی ڈیسیمن لے سکتے ہو۔“ صبا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آفتاب نے صبا کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔ ”صبا۔۔۔ کوئی اور بات کرو۔“

”میں کوئی اور بات کر لیتی ہوں۔ لیکن میری اس بات کو تم نظر انداز کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ صبا کو بشیر جیلانی پر اس دن کا غصہ ابھی تک تھا جب اس نے اسے آفتاب کا رابطہ نمبر نہیں دیا تھا۔ ”آؤ چلیں۔“

”کہاں۔؟“ آفتاب نے پوچھا۔

”کچھ دکھانا ہے تمہیں۔“ صبا مسکرائی۔

”کیا دکھانا ہے۔“ آفتاب نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے ساتھ چلو گے تو بتاؤں گی۔“ صبا نے کہا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کے دروازے کی طرف چلی۔ آفتاب نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

صبا نے کار ایک پوش علاقے کے بہت بڑے بنگلے کے سامنے کھڑی کر کے ہارن دیا کچھ ہی دیر بعد اس کا آہنی گیٹ کھلا اور صبا کا راندر لے گئی۔ دونوں باہر نکلے۔ آفتاب نے

بنگلے کے بیرونی حصے پر نظر ڈالی اور پوچھا۔ ”یہ کس کا بنگلہ ہے۔؟“

”پہلے دیکھ تو لو۔“ صبا نے مسکرا کر کہا اور اسے اندر لے گئی۔ وہ بنگلہ ہر قسم کے سامان سے عاری تھا۔ صبا اسے بنگلے کی تعریف کرتے ہوئے ایک ایک کمرہ دکھاتی رہی اور آفتاب بنگلے کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

”تو تم نے کیا پوچھا تھا کہ یہ کس کا بنگلہ ہے۔؟“ صبا نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں یہ ہی پوچھا تھا۔“ آفتاب نے کہا۔

”پہلے یہ بتاؤ یہ بنگلہ تمہیں کیسا لگا۔؟“ صبا نے سوال کر کے اس کی طرف دیکھا۔



”اچھا ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

”صرف اچھا۔؟“

”بہت ہی اچھا ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

”ایسا بنگلہ تم نے کبھی پہلے نہیں دیکھا ہوگا۔؟“ صبا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی گردن پھرا کر گئی تھی۔

آفتاب اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اُسے خوش کرنے کے لئے بولا۔ ”ہاں سڈنی میں بھی نہیں دیکھا۔“

”اس کا نقشہ میری پسند ہے۔ میں نے بنوایا ہے۔“ صبا نے کہا۔

”ونڈرفل.... ونڈرفل....“ آفتاب نے کہا۔

”اب بتاتی ہوں کہ یہ کس کا بنگلہ ہے۔ یہ ہمارا بنگلہ ہے۔“ صبا نے گردن کھڑی کر کے فخر سے کہا۔

”تم لوگ یہاں شفٹ ہو رہے ہو۔؟“ آفتاب نے پوچھا۔

”تم لوگ سے تمہاری کیا مراد ہے۔؟“ صبا نے پوچھا۔

”تمہاری فیملی۔“ آفتاب نے وضاحت کی۔

”نہیں۔“ اس نے مسکرا کر نفی میں گردن ہلائی۔

”پھر۔؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شادی کے بعد ہم یہاں رہیں گے۔“ صبا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ہم۔؟؟“ آفتاب نے متحیر سا ہو کر وضاحت چاہی۔

”ہم۔۔۔ یعنی کی میں اور تم۔ صرف ہم دونوں۔“ صبا نے کہا۔ اس کی بات سن کر

آفتاب نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ صبا پھر بولی۔ ”یہاں ہماری دنیا ہوگی۔ ہم دونوں

کی۔ بس ہم دونوں۔“ صبا نے آخری جملے کو دونوں بار بڑی وضاحت سے کہا۔ آفتاب سنجیدگی

سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ اس کا موبائل فون بول پڑا۔ اس نے

فوراً موبائل فون اپنی جیب سے نکالا صبا کو اس وقت موبائل فون کا بجنا قطعاً اچھا نہیں لگا تھا۔ اس

کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے موبائل فون چھین کر دور پھینک دے۔

آفتاب نے موبائل فون سنا۔ اس کے چہرے پر پریشانی عیاں ہو گئی تھی۔ اس نے بات

ختم کرتے ہی ایک نمبر ملایا اور بولا۔ ”چا چا جی... امی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میں

کچھ فاصلے پر ہوں۔ میں بھی پہنچ رہا ہوں آپ ڈاکٹر کو لے کر گھر پہنچ جائیں۔“ آفتاب نے

موبائل بند کیا اور صبا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی کا فون تھا۔ امی کی طبیعت اچانک

خراب ہو گئی ہے ہمیں جانا ہوگا۔“

صبا نے سنا اور اپنے چہرے کے ناگوار تاثرات کو مخفی رکھتے ہوئے جانے کے لئے چل

پڑی۔ کار اس بنگلے سے باہر نکلی اور آفتاب کے گھر کی طرف چل پڑی۔ آفتاب بہت مضطرب

تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لیکن راستے کی ٹریفک کارش اس کی جلدی میں مانع

تھا۔ دونوں چپ تھے۔ آفتاب کو اپنی امی کی پریشانی تھی اور صبا کو اس اچانک آفت پر غصہ تھا۔

☆.....☆.....☆

کار جیسے ہی آفتاب کے گھر سامنے پہنچی گیٹ آفتاب کے چھوٹے بھائی علی نے کھولا

تھا۔ آفتاب بھاگ کر اندر چلا گیا۔ اس وقت بشیر جیلانی کے ساتھ ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

”کیا ہوا۔ خیریت تو ہے۔“ آفتاب نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کی شوگر بڑھ گئی تھی۔ انجیکشن دے دیا ہے۔ کچھ

ہی دیر میں وہ اچھی ہو جائیں گی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”کچھ دوائیں بھی لکھ کر دی ہیں ان کا استعمال

پابندی سے کرائیں۔“

”آفتاب میں ڈاکٹر صاحب کو بھی ڈراپ کر دوں اور آتے ہوئے میڈیسن بھی لیتا

آؤں گا۔“ بشیر جیلانی نے کہا۔

آفتاب نے کہا اور اپنی امی کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی ماں بیڈ پر لیٹی ہوئی

تھی۔ آفتاب نے کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر ایک کرسی اٹھائی اور بیڈ کے پاس ہی رکھ کر بیٹھ

گیا۔ وہ پیار بھری نگاہوں سے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آفتاب....“ اس کی ماں نے اپنی بند آنکھوں سے شاید اسے دیکھ لیا تھا اور وہ نجیف آواز میں بولیں۔

”جی امی.... میں آفتاب۔“ آفتاب نے اپنی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”مجھے لگتا ہے کہ اب میرا آخری وقت آ گیا ہے۔“ وہ بولیں۔

”امی ایسی باتیں نہ کریں۔“ آفتاب نے فوراً کہا۔

”علی ابھی بچہ ہے۔ مجھے اس کی بہت فکر ہے۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ میرا بیٹا ہے۔ اور آپ ایسی کوئی بات نہ

کریں۔ چپ کر کے سو جائیں۔ ڈاکٹر نے آرام کے لئے کہا ہے۔“ آفتاب نے کہا۔ اس کی آنکھیں بھیک گئی تھیں۔

”علی کا خیال رکھنا۔“ وہ کچھ توقف کے بعد پھر بولیں۔

”اب آپ ایسی کوئی بات نہیں کریں گی۔ چپ چاپ سو جائیں۔ میں آپ کے پاس

بیٹھا ہوں۔“ آفتاب نے اپنی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ہولے ہولے دہاتے ہوئے کہا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ لگتا تھا کہ اس کی ماں سو گئی ہے۔ اچانک آفتاب کی ماں

جیسے چونکی ہو اور بولی۔ ”علی کہاں ہے۔؟“

”وہ یہیں ہے۔ میں بلاتا ہوں۔“ آفتاب نے کہا اور اپنی ماں کا ہاتھ آہستہ سے بستر پر

رکھا اور کمرے سے باہر جا کر پہلے اس نے بشیر جیلانی کو فون کیا۔

”چاچا جی مجھے امی کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ آپ ڈاکٹر صاحب کو ایک بار پھر

لے کر آئیں۔“

”میں لے آتا ہوں۔“ آواز آئی۔

”نہیں میں انہیں ہسپتال لے کر پہنچتا ہوں۔ میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ آپ بھی وہاں

آ جانا۔“ آفتاب نے اچانک کہا۔

”کس ہسپتال میں۔؟“

آفتاب نے ہسپتال کا نام بتا کر فون بند کیا۔ علی کو آواز دی اور ماں کے کمرے میں لے

گیا۔ وہ سو گئی تھیں۔ آفتاب نے علی کو ماں کے پاس بیٹھایا اور ایک بار پھر بشیر جیلانی کو فون کر دیا کہ وہ ہسپتال جانے کی بجائے گھر آ جائے۔

جونہی اس نے فون بند کیا آفتاب کے ذہن میں صبا کا خیال آیا اس نے متلاشی نگاہوں

سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کمرے میں واپس جا کر علی کو اشارے سے باہر بلا کر بولا۔

”صبا کہاں ہے۔ میرے ساتھ آئی تھی۔؟“

”وہ تو اسی وقت چلی گئی تھیں۔“ علی نے بتایا۔

”اُسی وقت۔؟ کیا وہ اندر نہیں آئی تھی۔؟“

”نہیں بھائی جان۔ جیسے ہی آپ اندر آئے اور میں ان کی طرف بڑھا کہ سلام کر لوں اور

انہیں اندر لے کر آ جاؤں۔ انہوں نے یکدم کار آگے بڑھائی اور چلی گئیں۔“ علی نے بتایا۔

آفتاب نے کچھ سوچا اور علی کو پھر کمرے میں بھیج دیا۔ آفتاب نے گیٹ کے پاس جا کر

دائیں بائیں نظر دوڑائی، صبا کی کار کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ حیران تھا کہ صبا اس کی ماں کی

طبیعت کا پتہ کرنے کے لئے دو قدم چل کر اندر نہیں آئی اور چلی گئی۔

اچانک علی کی تیز آواز آئی۔ ”آفتاب... بھائی...“

آفتاب بھاگا۔ اس کی ماں بیڈ پر لیٹے لیٹے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی

ہوئی تھیں۔ وہ کبھی علی اور کبھی آفتاب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آفتاب نے اپنی ماں کو اپنے

دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ ساتھ علی بھی تھا۔

عین وقت پر بشیر جیلانی اپنی کار لے کر آ گیا تھا۔ آفتاب نے اپنی ماں کو کار کی پیچھلی

سیٹ پر لٹا دیا۔

وہ ماں کو لے کر ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ ایمر جنسی وارڈ میں پون گھنٹہ تک ڈاکٹر علاج کرتے

رہے اور پھر وہ آفتاب اور علی کو اس دنیا میں چھوڑ کر چلی گئیں۔

علی آفتاب کے سینے سے لگا رہا تھا اور آفتاب اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں تھا۔

☆.....☆.....☆

فرح کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ شہر چھوڑ آئی تھی فلیٹ کی چابی واپس کر دی تھی دس لاکھ کا چیک لوٹا دیا تھا وہ عاشق کو پسند کرنے لگی تھی۔ اس کی چاہت اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بہت سوچ بچار کے بعد بھی اپنے دل کی بات عاشق سے نہیں کہہ سکی تھی۔ ہر بار یہ خیال آ جاتا تھا کہ اس کے اور عاشق کے مقام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ایک ایسا خلا ہے جو کسی بھی طرح سے نہیں بھر سکتا ہے۔ اس نے اس کے ہنگامے میں قدم رکھ کر دیکھ لیا تھا، نگہت بیگم کی اس کے بارے میں کیا رائے تھی وہ بھی جان گئی تھی۔ اس کے باوجود اس کا دل عاشق کے لئے مضطرب ہو گیا تھا۔

عاشق اسے اچانک اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کی گفتگو اور عادت اچھی لگنے لگی تھی۔ جب وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی تو اس نے اپنے گاؤں کا پتہ جو اس کی ڈائری میں لکھا ہوا تھا وہ سفید سوکچ بورڈ کی شیٹ پر لکھ دیا تھا۔ اور ایک امید ایک آس وہاں چھوڑ دی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی کاغذ کی کشتی پانی میں چھوڑ دے۔ جسے کنارہ ہوا کے جھونکے اور وقت کی لہریں ہی دے سکتی ہیں۔ ورنہ وہ کہیں بھی کسی بھی مقام پر ڈوب سکتی ہے۔

دادی اماں کے منہ سے ساری کہانی سن کر فرح کو تکایف ہوئی تھی۔ اس کا کرب اور دکھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ بے بسی میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے وہ بھیڑیوں کے بیچ میں آ گئی ہے۔

اندھیرا چھا گیا تھا۔ اور پھر کسی گاؤں کا اندھیرا تو اور بھی گہرا ہوتا ہے۔ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی رات شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا دن فجر کی اذان کے ساتھ نکلتا ہے۔ اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کام کاج شروع ہو جاتے ہیں۔ بستر گول ہو چکے ہوتے ہیں۔ چولہوں میں آگ اور دھواں اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی رواں دواں ہو جاتی ہے۔

اچانک فرح نے دادی اماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”دادی اماں میں اب کیا کروں۔“

”تو رک میں ابھی آتی ہوں۔“ دادی اماں نے کہا اور دروازے کی طرف جاتی ہوئی

بولی۔ ”دروازہ اندر سے بند کر لو۔ میں آواز دوں گی تو دروازہ کھولنا۔“

جونہی دادی اماں باہر نکلی فرح نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد دادی اماں نے

آواز دی تو فرح نے دروازہ کھولا دادی اماں کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اس نے آتے ہی فرح کے ماتھے پر بوسہ دیا اور تینوں کمرے میں چلی گئیں۔

اس عورت کا نام دولتے تھا۔ اس کا گھر دادی اماں کے گھر کے برابر میں تھا۔ وہ بھی فرح کے بارے میں سب جانتی تھی۔ وہ ایک ہمدرد عورت تھی اور اکثر پیشتر دادی اماں کی دیکھ بھال دہی کرتی تھی۔

”میں نے اسے کہہ دیا ہے اب یہ یہاں سے چلی جائے۔ ورنہ وہ اس کے ساتھ زبردستی کریں گے۔“ دادی اماں نے کہا۔

”پر یہاں سے جانا بھی کونسا آسان ہے۔ شیردل کے بندے سارے پنڈ میں ہوا کی طرح پھرتے رہتے ہیں۔“ دولتے نے کہا۔

”تو پھر کیا کریں۔؟“ دادی اماں نے کہا۔

”فرح ابھی یہاں چھپ کر رہے۔ ابھی اس کی کسی کو خبر نہیں ہوئی ہوگی۔“ دولتے نے کہا۔ ”میں اپنے پتر ظفر سے کہوں گی وہ اسے حفاظت سے یہاں سے نکالے۔ اکیلی جائے گی تو ٹھیک نہیں ہے۔“

”لیکن اسے پتہ چل گیا ہے مہنگے کو۔“ دادی اماں نے کہا کہ ساری بات بتادی۔ ”وہ بھی بھلی عورت ہے۔ تم ایسا کرو۔ فرح کو میرے گھر بھیج دو۔ میری بیٹی کے ساتھ رہے گی۔ اور ہم سوچتے بھی ہیں کیا کریں۔“ دولتے نے تجویز پیش کی۔

”کیوں فرح۔؟؟“ دادی اماں نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں یہاں ہی رہتی ہوں۔ اپنی دادی اماں کے پاس۔“ فرح نے کہا اور دادی اماں کے گلے کا ہار بن گئی۔

☆.....☆.....☆

چوہدری الطاف نے مسکرا کر شیردل کی طرف دیکھا۔ اور پھر ہنسا۔ اس وقت حویلی کے ایک کمرے میں شیردل، مہنگا اور چوہدری الطاف کا ایک خاص آدمی موجود تھے۔

”او..... مہنگے... ٹو نے اُسے دیکھا بھی ہے کہ ایسے ہی کہہ دیا ہے۔“ چوہدری الطاف نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں نے خود دیکھا ہے۔“ مہنگے نے آگے بڑھ کر کہا۔

چوہدری الطاف نے شیردل کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تو بے چین ہو رہا ہے فرح کو اپنی دوسری بیوی بنانے کے لئے۔ شہر بھر میں اس کی تلاش کرتا رہا اور وہ خود ہی گاؤں میں آگئی۔“

”پر اباجی ابھی اس کا پتہ نہیں لگ رہا۔“ شیردل نے کہا۔

”دیکھ پتر میں نے تو تمہارے کہنے پر فضل کریم کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ ٹو نے اپنی سفید گھوڑی کی قربانی فرح کے لئے دے دی تھی۔ اور مجھے اس کی زمین سے مطلب تھا۔ چھ سال کی وہ تھی اور ٹو تھا اس وقت سولہ سال کا تب سے وہ تمہاری نظر میں ہے۔“ چوہدری الطاف نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

”اگر وہ گاؤں میں آگئی ہے تو پھر اب اگر وہ چلی جاتی ہے اور ٹو ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے تو یاد رکھ آئندہ تمہاری زبان پر اس کا نام آیا تو تیرے راستے میں تجھے میں کھڑا ملوں گا۔“

شیردل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ”آپ مجھے چیلنج کر رہے ہیں اباجی۔؟“

”پتر جی یہ چیلنج نہیں ہے میں اچھا ہوں کہ برا جو بھی کرتا ہوں اپنے اصول کے مطابق کرتا ہوں۔ اچھا تو اصول اور اگر بُرا تب بھی اصول میں نہیں چھوڑتا۔“ چوہدری الطاف نے کہا۔

”اباجی اب وہ میری وہی بنے گی۔ اس حویلی میں وہ آپ کی بہو بن کر رہے گی۔“ شیردل نے مصمم ارادے سے کہا۔

چوہدری الطاف ہنس۔ ”دیکھ لیتے ہیں۔“

”آپ ہی نہیں پورا گاؤں دیکھے گا۔“ شیردل نے ایک بار پھر اسی لہجے میں کہا۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“ چوہدری الطاف نے اپنے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

چوہدری الطاف نے کہا۔ ”وہ تمہاری منگ ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ میری حویلی میں بہو بن کر آئے۔ ایسا کبھی ہوا نہیں ہے کہ ہم نے کسی چیز پر ہاتھ رکھا ہو اور وہ ہماری بنے نا۔“

”اب بھی ایسا نہیں ہوگا۔ فرح میری بہن کر رہے گی۔“

”اور اگر ہوا تو میری بات وہی ہوگی جو میں نے پہلے کہی ہے۔“ چوہدری الطاف اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو۔ جاتے ہوئے وہ رکا۔ اس نے مہنگے اور اپنے آدمی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ واپس شیردل کے پاس آیا اور بولا۔ ”مہنگا رات کی کالی چادر میں کسی کو دیکھ لے تو وہ غلط نہیں ہوتا۔ اس کی نظر کے سامنے سے ہوا کا جھوکا گزر جائے تو دوسری بار پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی جھوکا ہے کہ بدل گیا ہے۔ اس نے دیکھا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس گاؤں میں آگئی ہے۔“

چوہدری الطاف نے کہا اور اس کمرے سے باہر نکل گیا۔ شیردل کو اپنے باپ کی بات سن کر اور بھی تسلی ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی مونچھ کو تادیا اور جونہی جانے کے لئے گھوما وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے اس کی بیوی ناز و کھڑی تھی۔

شیردل نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا ہے۔؟؟“

”حویلی میں دوسری بیوی لانے کی تیاری ہو رہی ہے۔؟“ نازو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تیاری کا کیا مطلب۔؟ اُسے تو اس حویلی میں آنا ہی تھا۔ تجھ سے پہلے کی پسند ہے وہ میری۔“ شیردل نے کہا۔

”دوسری وہی لاتے ہوئے شرم تو نہیں آئے گی تجھے۔“ نازو نے کہا۔

”شرم کس بات کی۔؟“ شیردل نے دوسری طرف دیکھ کر کہا۔

”دس سال کی تیری بڑی بیٹی ہے۔“

شیردل نے اس کی بات سن کر اپنی گردن اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”جب تیرا باپ

تیسری وہی اپنے پنڈ میں لایا تھا تو اس کے دو مہینے کے بعد تیری شادی مجھ سے ہوئی تھی۔“

”میرا باپ پورے پنڈ کا مالک ہے۔“ نازو نے اترا کر کہا۔

”وہ تو ہم بھی ہیں۔“

”ہم اور میں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جتنی زمین میرے باپ نے اپنی ایک ایک بیوی



کے نام لگوائی ہے تیرے حصے تو اس سے آدھی بھی نہیں آئے گی۔“ نازو نے ناک چڑھا کر کہا۔  
نازو کی بات سن کر شیردل کو اس پر غصہ آ گیا تھا۔ وہ اُسے گھورنے لگا تھا۔ اور نازو اپنی  
بات کہہ کر اس کے سامنے نڈر کھڑی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اُسے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

”بولو اب بولتے کیوں نہیں ہو۔“ نازو بولی۔

”جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔“ شیردل نے ہاتھ مار کر کہا۔

سیدھی طرح سے کیوں نہیں کہتے کہ بولتے وہ ہیں جن کے پلے کچھ ہو۔“ نازو نے اس  
کے کندھے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

شیردل اس کی طرف گھوما اور چاہتا تھا کہ وہ اس پر ہاتھ اٹھا دے لیکن پھر اپنا غصہ پینے کی  
کوشش کرنے لگا۔

”میرے باپ نے اپنے بھائیوں کی پرواہ نہیں کی تھی۔ جس زمین پر پیر رکھا تھا اُسے اپنا  
کر لیا تھا۔ تُو کر سکتا ہے ایسا۔؟ کر سکتا ہے تو۔ پھر میری طرف سے تُو ایک فرح کو چھوڑ کر چار اور  
اس حویلی میں لے آ۔“ نازو نے کہا۔ ”دو گز زمین پر کر کھڑے ہو کر اس طرح گردن اکڑانے کا  
کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”یہ بھی کر دکھاؤں گا ایک دن۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔

”ایک دن۔“ وہ تمسخرانہ انداز میں مسکرائی۔ ”تُو اپنے بھائیوں سے چھوٹا ہے لیکن اس  
پنڈ کی چوہدرا نی کہلانے کا مجھے شوق ہے۔ کچھ نہیں ہوگا تم سے۔“

”پہلے فرح کو اس حویلی میں لے آؤں۔ اباجی نے جو بات کی ہے وہ پوری کر دکھاؤں۔  
اس کے بعد دیکھنا کیا ہوتا ہے۔“ شیردل کی آنکھوں میں سرخی اُتر آئی تھی۔

نازو نے اس کی طرف دیکھا اور ناک چڑھا کر اپنی گردن جھٹکی اور چلی گئی۔



آدھے چاند کو دیکھتے ہوئے فرح سوچ رہی تھی کہ چاند کتنوں کا راز داں ہے۔ کتنے ہیں  
جو اس سے اپنے دل کی بات کرتے ہیں اپنے اندر کی تنہائی کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتے  
ہیں اور آنکھ میں آئے ہوئے آنسو بھی اس کے سامنے بہا دیتے ہیں۔ بھوک میں کوئی تڑپتا ہوا  
اپنے اندر سے نکلنے والے الفاظ کو شاعری کی شکل دے کر اُسے دیکھتا ہے۔ لیکن چاند تو چپ رہتا  
ہے۔ بالکل خاموش جو کچھ نہیں کر سکتا ہے۔

فرح کمرے کا تھوڑا سا دروازہ کھولے چاند دیکھ رہی تھی۔ اس کی پشت میں دادی اماں  
چار پائی پر بیٹھی عشاء کی نماز کے بعد تسبیح کر رہی تھی۔ اچانک دروازے کی زنجیر بجی دادی اماں  
کے ساتھ ساتھ فرح بھی چونک پڑی۔

فرح نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ انجانا خوف اس کے چہرے سے عیاں ہونے  
لگا۔ دادی اماں اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

”باہر نہیں نکلنا۔ میں دیکھتی ہوں۔“

”دادی اماں آپ بھی رہنے دو۔“

”شاید دو لیتے نہ ہو۔“ دادی اماں نے کہا اور دروازے کی طرف چلی گئی۔ اس دوران

تین چار بار زنجیر پھر بجی۔

”کون ہے۔؟“ دادی اماں نے پوچھا۔

”مم... میں ہوں۔“ نوراس کی آواز آئی۔

”اس وقت... کیا بات ہے نوراس؟“ دادی اماں نے دروازہ کھولنے کی بجائے متحیر ہو کر پوچھا۔

”دروازہ تو کھولو دادی۔“ نوراس نے پھر کہا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔

دادی اماں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے نوراس کھڑی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ دادی اماں ابھی اس کی طرف دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک بائیں طرف سے شیردل سامنے آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مہنگا اور ایک آدمی اور نمودار ہو گئے تھے۔ دادی اماں انہیں دیکھتے ہی گھبرا گئی۔

”نوراس! اب جا۔ تیرا اتنا ہی کام تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید دادی اماں میری آواز سن کر دروازہ نہ کھولے۔ اس لئے مجھے نوراس کو اپنے ساتھ لانا پڑا۔“ شیردل نے کہا اور اندر چلا گیا۔ نوراس واپس پلٹ گئی۔

”کک... کیا بات ہے شیردل۔ خیر تو ہے۔؟“ دادی اماں نے گھبرا کر پوچھا۔

”خیر ہی ہے۔ کیا میں اس گھر میں نہیں آ سکتا۔ پہلے نہیں آتا تھا۔“ شیردل آگے چل پڑا۔ دادی اماں اس کی پیچھے لپکی۔ مہنگے نے دروازہ بند کر دیا۔

”لیکن تو نوراس کو اس طرح سے کیوں لایا تھا۔ تیری آواز پہ پہلے میں دروازہ نہیں کھولتی تھی کیا۔؟“ دادی اماں نے کہا۔

”پہلے کی بات کچھ اور تھی۔ آج کی بات تو کچھ اور ہی ہے۔“ شیردل نے مسکرا کر کہا اور کشادہ صحن میں آدھے چاند کی روشنی میں اس کی متلاشی نگاہیں دوڑنے لگیں۔

”پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔؟“ دادی اماں نے کہا۔ وہ گھبرا گئی تھی۔

”کیا بات ہے دادی... تیری آواز کانپ رہی ہے۔؟“ شیردل نے پوچھا۔

”نن... نہیں۔“

”کانپ رہی ہے دادی۔“

”سردی ہے ناں اس لئے۔“

”تو پھر اندر کمرے میں چلتے ہیں۔“ شیردل کمرے کی طرف چلا۔ دادی اماں جلدی سے

اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”تو جانتا ہے شیردل یہ وقت میرا تسبیح کرنے کا ہوتا ہے۔ اب تم جاؤ اور صبح آنا۔“ دادی اماں نے کہا۔

”ہم نے تجھے تسبیح کرنے سے روکا ہے۔ تو اپنی تسبیح کر۔ ذکر کر۔ تیرے ذکر کی ہی تو برکت ہے دادی۔“ وہ مسکرایا۔ ”اندر بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ مہنگے تم اس کمرے میں بیٹھ جاؤ۔ میں دادی اماں کے ساتھ بیٹھوں گا۔“ شیردل نے کہا اور مہنگا جلدی سے اس کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھنے لگا۔ وہ کمرہ خالی تھا۔ اس نے باہر گردن نکال کر کہا۔

”چوہدری صاحب... آپ کے لئے دادی اماں والا کمرہ ہی ٹھیک رہے گا۔“

شیردل نے دادی اماں کو اپنے ہاتھ سے ایک طرف کیا اور اس کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے فرح ڈری، سہمی اور خوفزدہ ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کی وحشت زدہ نگاہیں یکدم شیردل کے چہرے پر گئیں اور شیردل زہریلے انداز میں یوں مسکرایا جیسے اُس کی من چاہی چیز مل گئی ہے۔

☆.....☆.....☆

فرح کی نگاہوں میں خوف اور چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی، دل ڈر سے بے قابو ہوئے جا رہا تھا۔ شیردل نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ بکھیر کر دو قدم اس کی طرف بڑھا، فرح اور سمٹ گئی۔ دادی اماں پیچھے سے نکل کر تیزی سے شیردل کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”دیکھ شیردل... تو یہاں سے چلا جا۔ خبردار جو تو نے میری پوتی کو ہاتھ بھی لگایا۔“ دادی اماں کے لہجے میں ایک ایسا تغیر تھا لگتا نہیں تھا کہ وہ ایک بوڑھی عورت ہے۔ نا جانے ایسی قوت اس کے اندر کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”دادی! تو مجھے ایسا سمجھتی ہے کیا۔“ شیردل نے کہا۔ ”میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ کیا یہ فرح ہی ہے۔ وہ فرح جس کو میں شہر میں تلاش کر رہا تھا اور یہ اچانک جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ یہ وہی

ہے جس کے لئے میں نے اتنا انتظار کیا ہے۔“

”شیردل میں پھر کہتی ہوں کہ چلا جا یہاں سے۔“ دادی اماں بولی۔

”میں یہاں کونسا بیٹھنے کے لئے آیا ہوں۔ دیکھنا تھا بس دیکھ لیا۔“ شیردل نے کہا۔

”اپنے دل سے یہ خیال نکال دے کہ تُو میری پوتی سے شادی کرے گا۔“ دادی اماں

نے کہا۔

شیردل نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”یہ مت کہہ دادی۔ یہ میری منگ ہے۔ ہم گردن کٹوا لیا کرتے ہیں منگ نہیں چھوڑا کرتے۔ آخر تُو بھی ہمارے ہی خاندان کی ہے۔ تجھے تو یہ بات یاد دلانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔“

”تُو میری زندگی میں ایسا نہیں کر سکے گا۔“ دادی اماں نے درشت لہجے میں کہا۔

شیردل ہنسا۔ ”میں انتظار کر لوں گا۔ تیری زندگی کے دن ہی کیا باقی ہونگے۔“

”نکل یہاں سے۔“ دادی اماں نے کہا۔

”دیکھ دادی.... میں یہاں اسے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ جب نوراں آئی تھی تو تُو نے اسے کہیں چھپا دیا تھا۔ اب میں نے دیکھ لیا ہے۔ تُو جانتی ہے یہ سارا گاؤں ہمارا ہے۔ اس گاؤں کے بندے ہمارے ہیں۔ یہ اب یہاں سے جانے کی غلطی نہ کرے۔ ورنہ ہر جگہ ہمارے بندے اسے دیکھ لیں گے۔ اور اگر ایسا ہوا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ شیردل نے آخر جملہ بڑے درشت لہجے میں کہا تھا کہ فرح کانپ سی گئی تھی۔

دادی اماں کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ شیردل کے سامنے جوڑ دیئے۔ ”دیکھ شیردل۔ تُو میری پوتی کا خیال اپنے دل سے نکال دے اسے یہاں سے جانے دے۔“

”دادی تُو کچھ اور مانگ لے۔ ایسا مت کہہ۔“

”فرح تیری بیٹی جیسی ہے۔“

”نہیں وہ اس سے چھوٹی ہے۔“ شیردل ڈھیٹ لہجے میں بولا۔

”ہم کمزور ہیں۔ ہمیں مت ستا شیردل۔“

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ کمزور ہو تو ہمارے متھے مت لگو۔ اباجی سے بات کرتا ہوں پھر تجھے بتا دوں گا۔ سادہ سا نکاح ہوگا اور اپنی منگ کونے جاؤں گا۔“ شیردل نے کہا۔

”شیردل.....“ دادی اماں پھر اس کی طرف بڑھی۔

فرح تیزی سے آگے بڑھی اور دادی اماں کے ہاتھ پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیئے۔ ”چھوڑو دادی اماں.... ظالموں سے بھیک نہیں مانگا کرتے۔ میں اب یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ اسی جگہ رہوں گی۔ اور اپنے خدا سے مدد مانگوں گی۔ دیکھتی ہوں اس کا ظلم بڑھتا ہے کہ میرے خدا کی مدد پہنچتی ہے۔“ فرح نے جیسے اپنا ڈر اور خوف کی چادر ایک طرف پھینک دی ہو۔

اس کی بات سن کر شیردل ہنسا اور بولا۔ ”مقابلہ کرتے لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ مجھے اچھا لگا کہ تم نے بھی مجھے چیلنج کیا۔ اب آئے گا مزہ۔“ شیردل نے کہا اور ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ دادی اماں نے دروازہ بند کیا اور فرح سے کہا۔

”یہ بڑا خطرناک ہے اپنے سارے بھائیوں سے زیادہ خطرناک اور غندی ہے۔“

”دادی اماں.... میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ نہ رات کے اندھیرے میں اور نہ دن کی روشنی میں۔ میں اپنے خدا سے مدد مانگوں گی اور بس۔“ فرح نے مصمم ارادے سے کہا۔

☆.....☆.....☆

شیردل جب اپنی حویلی میں پہنچا تو نشست گاہ میں چوہدری الطاف اس کی بیوی اور ناز و موجود تھے۔ شیردل نے سب کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ شیردل نے پوچھا۔

”تم بھی سن لو۔“ چوہدری الطاف نے اطمینان سے کہا۔

”تیری بیوی حصہ مانگ رہی ہے۔“ چوہدری الطاف کی بیوی نے ماتھے پر ہل ڈال کر کہا۔

”حصہ نہیں ماں جی۔ اپنے بچوں کا حق مانگ رہی ہوں۔ یہ دوسری شادی رچانے چلا

دھڑکن  
ہے۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا۔“ نازو فوراً بولی۔ ”پہلے میرے بچوں کے نام زرا اور زمین لگائے  
پھر شادی کرے۔“

شیردل بے فکری سے ہنسا اور اپنے باپ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں نازو کی  
طرف تھیں۔ ”تجھے کس بات کی فکر ہے۔ میں نہیں دوں گا تو تیرا باپ ہے ناں تجھے اور تیرے  
بچوں کو دینے کے لئے۔“

نازو نے اس کی بات سنی اور کہا۔ ”دینے کی بات کرتے ہو تو اس کے پاس دینے کے  
لئے بہت کچھ ہے۔ لیکن مجھے اور میرے بچوں کو تجھ سے چاہئے۔ جو تیرا حصہ ہے وہ۔“

”جیسے کی بات مت کرو۔“ شیردل یکدم کرخت لہجے میں بولا۔ ”جہاں ہے چپ کر کے  
پڑی رہ۔ اور اگر تیرا خیال ہے کہ تمہاری اس دھمکی سے میں اس سے شادی نہیں کروں گا تو یہ تیرا  
خیال ہے جو تُو اپنے دل سے نکال دے۔“

”مجھے دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بچوں کو پہلے ان کا حق دو پھر جس سے  
چاہو شادی کرو۔“ نازو نے کہا۔

”کچھ نہیں ہے۔ جاؤ اندر چلی جاؤ۔“ شیردل نے کہا۔

”پھر جو تم سوچ رہے ہو وہ بھی نہیں ہوگا۔“

”تُو مجھے روکے گی۔؟“ شیردل نے تیخ پاہو کر کہا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھا۔

”چیلنج کا بڑا شوق ہے تجھے، کر مجھے چیلنج پھر دیکھتی ہوں کیسے تُو اس سے شادی کرتا

ہے۔“ نازو نے ایک بار پھر اپنی ناک چڑھائی۔

شیردل اس کی طرف اپنے ہونٹ بھیج کر بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا ہاتھ اُس پر

اٹھاتا چوہدری الطاف نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”شیردل... رک جا۔“

شیردل رک گیا لیکن وہ قہر آلود نگاہوں سے نازو کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ نازو اس کے

سامنے بڑے اطمینان سے کھڑی تھی۔

”شیردل تم میرے پاس آؤ۔“ چوہدری الطاف نے کہا اور شیردل بیچ و تاب کھاتا ہوا

چوہدری الطاف کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس کے بعد چوہدری الطاف نے نازو سے

کہا۔ ”نازو... تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ میں بات کرتا ہوں شیردل سے۔“  
”آپ کیا بات کریں گے۔؟“ نازو نے کہا۔ ”آپ نے ہی تو سب کچھ کیا ہے اس کے  
لئے اور...“ نازو جان بوجھ کر چپ ہو گئی۔

”اور...؟؟“ چوہدری الطاف نے اس کی طرف دیکھا۔

”اور جائیداد کے لئے۔“ نازو نے ادھورا جملہ مکمل کر دیا۔

نازو کی بات سن کر چوہدری الطاف کو غصہ تو بہت آ گیا تھا۔ شیردل کی ماں نے بھی گھور کر  
نازو کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن چوہدری الطاف کے نزدیک مصلحت اس میں تھی کہ وہ خاموش  
رہے۔ اس نے اپنے غصے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر کہا۔

”یہ جائیداد زمین ہم چوہدریوں کی پگ (پگڑی) ہوتی ہے۔ اسے لینا چھیننا، ہم  
مردوں کے کھیل ہیں۔ اس کا ذکر آئندہ اپنی زبان پر مت لانا۔ اور رہی بات اس کی شادی کی  
اسے میں دیکھتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ اگر میرے منہ سے الفاظ نکل سکتے ہیں تو وہ واپس بھی  
ہو سکتے ہیں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

نازو نے ایک نظر شیردل کی طرف دیکھا اور پھر وہ اس جگہ سے چلی گئی۔ اس کے جاتے  
ہی شیردل کی ماں بھڑک اٹھی۔

”یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ شیردل اب میں تجھے کہتی ہوں کہ تم اس لڑکی سے شادی  
کرو۔ اسے اس حویلی میں لے کر آؤ۔“

”چپ رہو۔“ چوہدری الطاف نے ہاتھ کے اشارے سے شیردل کی ماں کو چپ رہنے  
کے لئے کہا۔ ”نازو جس باپ کی بیٹی ہے وہ ہم پر بھاری ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نازو پر  
اٹھا ہوا شیردل کا ہاتھ میں روکنے کا حکم نہ دیتا۔“

”تو اب کیا اباجی ہم اس سے ڈر کر رہیں۔؟“ شیردل نے کہا۔

”ڈرنا اور بات ہوتی ہے بیٹا جی۔ سوچ سمجھ کر چلنا اور عقل کی مار دینا الگ بات ہوتی

ہے۔“ چوہدری الطاف نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”نازو اپنے باپ کی طاقت کے بل

بوتے پر اس حویلی کی چھت کے نیچے ہم سے بات کرتی ہے۔ سنبھل کر چلو۔ ویسا کرنا جیسا میں



کہوں گا۔“ چوہدری الطاف نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تم فرح سے نکاح کر کے بھلے دوسرے دن اُسے چھوڑ دینا لیکن اس حویلی کی روایت قائم رکھنا کہ اس چھت کے نیچے جو فیصلے ہوتے ہیں اس پر ہم قائم رہتے ہیں۔ تم فرح کو دوسری حویلی میں لے جانا۔“

☆.....☆.....☆

آفتاب ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی ماں کی بے وقت کی رحلت نے اسے غم میں ڈبو دیا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی علی اور بہن کے لئے اس نے ان کے سامنے آنسو نہیں بہائے تھے۔ آفتاب کے پاس ایک ہی کندھا تھا اور وہ بشیر جیلانی کا تھا۔ جس پر وہ سر رکھ کر اتار دیا تھا کہ جیسے اس نے اپنے اندر کے سارے آنسو ایک ہی بار بہا دیئے ہوں۔

صبا اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک بار ہی آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے فون کر کے بھی اس کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ جب نادیہ نے اس بارے میں اُسے کہا تھا تو اس نے عجیب سا منہ بنا کر کہا تھا کہ مجھے آفتاب کا مرجھایا ہوا چہرہ اچھا نہیں لگتا۔ اس کے گھر میں رونا دھونا لگا ہوا ہے۔ چند دنوں میں جب غم کے بادل چھٹ جائیں گے تو وہ آفتاب کو مل لے گی۔ آفتاب نے جب اپنے آفس میں قدم رکھا تو اس کا دل نہیں چاہا وہ کوئی کام کرے۔ اس لئے وہ جلد ہی اپنے گھر آ گیا تھا۔ وہ علی اور اپنی بہن کے ساتھ رہا۔

چند دن گزرے تو آفتاب پھر سے اپنے بزنس کی طرف لوٹے لگا تھا۔ علی اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا تھا اور اس کی چھوٹی بہن اپنے سسرال واپس چلی گئی تھی۔

اُس رات آفتاب اور علی گھر میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آفتاب اُس سے اس کی پڑھائی کے بارے میں بات کر رہا تھا کہ ڈور بیل ہوئی۔

جب علی واپس آیا تو اس کے ساتھ صبا بھی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اور وہ آفتاب سے معمول کی ملاقات کرنے کے لئے آئی ہے۔ اس نے آفتاب کی طرف دیکھتے ہی کہا۔

”آج تمہارا چہرہ ٹھیک لگ رہا ہے۔“

”پہلے ٹھیک نہیں تھا کیا۔؟“ آفتاب نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔  
”لگتا ہے کہ تم واپس زندگی کی طرف لوٹ آئے ہو۔“ صبا نے کہا۔  
آفتاب نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”کہاں تھی بڑے دنوں کے بعد مل رہی ہو۔؟“  
”اس کا مطلب ہے کہ میں تمہیں یاد تھی۔“ صبا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔  
”بھائی میں اپنے کمرے میں ہوں۔“ علی نے کہا اور جانے کے لئے مڑا۔  
”علی رک جاؤ۔ تم میرے پاس رہو۔ اکیلے کمرے میں کیا کرو گے۔“ آفتاب نے فوراً اُسے روک لیا۔

”آفتاب... اسے جانے دو۔ ویسے بھی میں تمہیں لینے کے لئے آئی ہوں۔“ صبا نے کہا۔

”سوری صبا میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ آفتاب نے صاف انکار کر دیا۔

”کیوں۔؟؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے علی کے پاس رہنا ہے۔“

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ اس دن کی اُدھوری بات۔“ صبا نے کہا۔

”ہاں تو کرو۔ بیٹھو۔“ آفتاب نے کہا۔ ”میں علی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

صبا نے ایک بار علی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”آفتاب... علی کو اکیلا رہنے کی عادت ڈالنے دو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔؟“ آفتاب نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اس دن تمہیں بتانے والی تھی کہ وہ بنگلہ ہمارا ہے۔ ہم دونوں اس میں رہیں گے۔ جب ہم اپنے اس بنگلے میں رہیں گے تو علی کو یہاں اکیلے رہنے کی عادت ہونی چاہئے۔“ صبا نے جلاتا مل کہا۔

آفتاب نے علی کو اپنے پاس کرتے ہوئے کہا۔ ”صبا آئندہ تم ایسی بات مت کرنا۔ ہم ایک ساتھ رہیں گے۔ اس گھر میں۔ اس چھت کے نیچے۔“

”اس گھر میں۔؟؟“ صبا حیرت سے چونکی۔ ”ہرگز نہیں۔ ہم الگ رہیں گے۔ اپنے اس

”فضول کی بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ آفتاب نے نرمی سے کہا۔

”تم اسے فضول کی بحث کہہ رہے ہو۔ میں تم سے شادی کر رہی ہوں۔ تمہارے کسی بھائی اور بہن کو اپنے ساتھ رکھنے کی ذمہ داری نہیں لے رہی۔“ صبا بھڑک اٹھی۔

”میں جب پھر سے اس شہر میں آیا تھا تو میرے دو مقصد تھے۔ اپنا بزنس کرنا اور تم سے شادی کرنا۔ تاکہ میں اپنی محبت کو پاسکوں۔ میں جانتا تھا کہ تم ایک مغرور لڑکی ہو۔ اس کے باوجود میں نے تم سے منگنی کی۔ لیکن میں یہ برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی مجھے اپنے بھائی اور بہن سے الگ کرے۔“

”میں کوئی نہیں ہوں۔؟ میرا نام صبا عظیم ہے۔ جو چاہا وہ پایا ہے میں نے۔“ وہ تمکنت سے بولی۔

”لیکن تم مجھے ایسے نہیں پاسکوگی۔“

”بھول جاؤ کہ میں جس پر ہاتھ رکھوں اور اُسے کھودوں۔“ صبا اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”اور یاد رکھو تم میں اُسے اپنی ٹھوکر پر رکھتا ہوں جو مجھے اپنے حکم کا غلام سمجھے۔“ آفتاب نے بھی جواب دینے میں تغافل سے کام نہیں لیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی نے صبا عظیم کو اس کے سامنے کھڑے ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسا کہا تھا۔ اور پھر آفتاب نے جس کے پیار میں وہ پاگل تھی۔ جس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ صبا کو اس بات نے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”تم مجھ سے کل بات کرنا۔ ابھی تم اپنی ماں کے غم میں ہو۔“

”اگر تمہارا ارادہ یہ ہی ہے تو میری باتیں کل بھی یہ ہی ہوں گی۔“ آفتاب نے مصمم ارادے سے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

صبا عظیم نے آفتاب کی طرف اپنی نگاہیں جماتے ہوئے دیکھا اور غصے سے باہر جاتے ہی دروازہ اس قوت سے بند کیا کہ دھماکہ پورے گھر میں سنائی دیا۔ صبا نے اپنی کارنگالی اور

تیزی سے ایک طرف موڑ دی۔ صبا کورہ رہ کر آفتاب کی باتیں اور اپنی کہی ہوئی بات کے رد ہونے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ جیسے جیسے اس کا غصہ بڑھ رہا تھا اس کی کار کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور پھر اگلے چوک میں بائیں طرف سے آتی ہوئی دین سے اس کی کار ایک دھماکے سے ٹکرائی۔ صبا خون میں لت پت بے ہوش ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

عاشر نے خاور کو اپنے ساتھ لیا اور اس گاؤں کی طرف چل پڑے جہاں کا پیہ فرح نے سوچ بورڈ کی شیٹ پر لکھا تھا۔ کارڈرائیور چلا رہا تھا۔ آگے عاشر اور چھپلی سیٹ پر خاور براجمان تھا۔

”اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی اپنی بات دل میں لئے چلی گئی۔ کسی آواز کی آس میں اس اُمید پر کہ شاید اُس کے راستے میں تم آ جاؤ اور اُسے جانے سے روک لو۔“ خاور نے کہا۔

”اچھا ہوتا کہ وہ مجھ سے بات کر لیتی۔“ عاشر نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تمہارے اور اس کے بیچ کی خلیج وہ کیسے عبور کرتی کہ تم سے وہ بات کرتی۔؟ اس خلیج کو تم اُس پار جا کے اُس سے بات کرتے تو بات بنتی۔ جیسے کہ اب تم اُس پار جا رہے ہو۔“ خاور نے کہا۔

”یہ سفر کب ختم ہوگا۔“ عاشر نے اکتا کر کہا۔

”جب وہ گاؤں آ جائے گا۔“

”اور وہ گاؤں کب آئے گا۔“

”ابھی کم از کم ایک گھنٹہ کا سفر باقی ہے۔“ خاور نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

کار سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔ دونوں کبھی باتیں کرنے لگتے اور کبھی چپ ہو جاتے تھے۔ عاشر کے ذہن میں فرح کا ہی خیال تھا۔ اس کی آنکھوں میں فرح بسی ہوئی تھی۔ وہ جلد اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وقت اور بے چینی کی تلواریں جب سفر کا ایک حصہ ختم ہوا اور کار اس سڑک پر اتری جو سیدھی اس گاؤں کی طرف جاتی تھی تو عاشر اور بھی پر جوش ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

خوف مترشح تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے خدا سے مدد مانگ رہی تھی۔

شیردل یہ چاہتا تھا کہ فرح کسی شور شرابے کے بغیر اس کے ساتھ چل پڑے۔ چوہدری آفتاب نے اسے ہدایت کی تھی کہ گاؤں میں شور ہوگا تو بات کسی نہ کسی طرح سے نازو کے کان میں بھی پہنچ جائے گی اور پھر کچھ بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔

”چلو میرے ساتھ ورنہ۔۔۔۔۔“ شیردل نے فرح سے کہا اور اس کے اشارے پر اس کے آدمی نے پستول نکال کر دادی اماں کی کنپٹی پر رکھ دیا۔  
فرح نے فوراً کہا۔ ”میں چلتی ہوں۔ میں چلتی ہوں لیکن میری دادی اماں کو کچھ مت کہو۔“

”تو پھر چلو۔“ شیردل نے کہا اور فرح لاچار اٹھ کھڑی ہوئی۔

”فرح میری جان کی فکر مت کر۔ مت جان کے ساتھ۔“ دادی اماں نے روتے ہوئے کہا۔  
”دادی اماں یہ آپ کو مار دیں گے تو کیا یہ آفت ٹل جائے گی۔؟ تب میں اور بھی بے سہارا ہو جاؤں گی۔“ فرح نے کہا۔ وہ بے بس ہو گئی تھی۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

”مجھے بھی لے کر چلو۔ میں بھی جاؤں گی۔“ دادی اماں نے کہا۔

☆.....☆.....☆

فرح اور دادی اماں کو اپنی جیب میں بیٹھا کر وہ اپنی دوسری حویلی میں لے گئے تھے۔ اس حویلی میں چوہدری الطاف کے آدمی اس کے دوسرے بیٹے اور خود چوہدری الطاف بھی موجود تھا۔ اس وقت وہ سب حویلی کے احاطے میں موجود تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں فضل کریم کو انہوں نے بندوق دے کر اپنی چال میں پھنسا یا تھا۔ فرح اپنی دادی کے ساتھ ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اور شیردل بہت خوش تھا۔ ایک آدمی نکاح خواں کو لینے کے لئے گیا تھا۔ اسی کا انتظار تھا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری آفتاب نے نازو کے ساتھ یہ چال کھیلی کہ اس کے سامنے شیردل کو اس انداز میں ڈانٹ دیا کہ وہ فرح سے نکاح نہیں کرے گا۔ اور یہ بھی دھمکی دے دی کہ اگر اس نے ایسا کچھ کیا تو وہ اسے اپنی جائیداد سے عاق کر دے گا اور جائیداد کا ایک حصہ نازو کے نام کر دے گا۔ شیردل گردن جھکائے کھڑا رہا اور پھر باہر نکل گیا۔ نازو چوہدری الطاف کی چال میں آگئی۔ یہ سن کر اس کی گردن کھڑی ہو گئی، چہرے پر فاتح جیسی مسکراہٹ آگئی اور حسب عادت اس کی ناک بھی چڑھ گئی تھی۔ وہ اطمینان سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شیردل نے اپنے بھائی اپنے ساتھ لئے اور انہیں دوسری حویلی میں جانے کے لئے کہا اور خود اپنے آدمیوں کے ساتھ دادی اماں کے گھر کی طرف چل پڑا۔

شیردل نے اپنی ٹانگ کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور وہ سب اندر چلے گئے۔ کمرے میں دادی اماں کے ساتھ فرح بیٹھی تھی۔ شیردل اور اس کے آدمیوں کو دیکھتے ہی وہ خوفزدہ ہو گئی تھیں۔

”چلو فرح۔۔۔ آج اور ابھی تجھ سے میرا نکاح ہے۔“ شیردل نے کہا۔

”شیردل خبردار جو تُو نے فرح کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا۔“ دادی اماں نے چیخ کر کہا۔

”تو کیا ہوگا۔“ شیردل نے کہا۔

”ایسا ظلم مت کر شیردل کے تجھے اس کا خدا کے سامنے حساب دینا مشکل ہو جائے۔“ دادی اماں نے کہا۔

”دادی مجھے باتوں میں مت ڈال۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اور سن فرح ہمارے ساتھ خود ہی چل پڑے تو اچھا ہے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ اور اگر شور شرابہ کرنا ہے تو مجھے بھی پرواہ نہیں ہوگی پورا گاؤں سنتا ہے تو سنے۔“ شیردل نے کہا۔

”فرح نہیں جائے گی۔“ دادی اماں نے فرح کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

”اس کا مطلب ہے تو چاہتی ہے سارے گاؤں کو یہ پتہ چلے کہ میں فرح کو اٹھا کر اپنی حویلی میں لے گیا ہوں۔“ شیردل نے اپنا قدم فرح کی طرف بڑھایا۔ فرح کی آنکھوں سے

عاشراور خاور اس مکان کے سامنے کھڑے تھے جہاں سے ابھی ابھی فرح اور دادی اماں کو دوسری حویلی میں شیردل لے گیا تھا۔ ان کے پاس دو لٹے کھڑی تھی۔ وہ انہیں ساری کہانی سنا چکی تھی اور اب کہاں لے کر گئے ہیں اس کا اس نے نوراں سے پتہ کر کے بتا دیا تھا۔ عاشراور خاور اس حویلی کی طرف چل پڑے۔

راستے میں ہی عاشرا نے فیاض احمد کو فون کر کے اس گاؤں کا پتہ سمجھایا اور مزید کچھ کہنے سننے کے بعد فون بند کر دیا۔

بڑے آہنی گیٹ کے سامنے رک کر عاشرا نے ایک ملازم کو چوہدری الطاف سے ملنے کے لئے کہا۔ اور بتایا کہ وہ شہر سے آئے ہیں۔

ابھی نکاح خواں نہیں آیا تھا شہر سے کون آیا ہے چوہدری آفتاب نے انہیں اندر بھیجنے کے لئے کہا۔

جب عاشراور خاور اندر گئے تھے عاشرا کی متلاشی نگاہ نے فرح کو تلاش کرنے میں دیر نہیں کی۔ اس کی نگاہیں اس پر رک گئی تھیں جبکہ قدم چوہدری الطاف کی طرف اٹھ رہے تھے۔ فرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔

عاشرا کے قدم چوہدری الطاف کی طرف جا رہے تھے لیکن اچانک ان کا رخ تبدیل ہوا اور وہ فرح کی طرف چل پڑا۔ سب کی نگاہیں اس جانب اٹھ گئی تھیں۔ وہ متحیر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ عاشرا نے فرح کے پاس جا کر اسے مخاطب کیا۔

”فرح۔“

ایک مانوس آواز جو نہی اس کے کان میں پڑی اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنی پلکیں اوپر کیں۔ سامنے عاشرا کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں خیرہ تھیں۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامنے عاشرا حقیقت میں کھڑا ہے کہ یہ کوئی خواب ہے۔ وہ تو اپنے خدا سے مدد مانگتے ہوئے درود شریف کا ذکر کر رہی تھی۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے عاشرا کھڑا تھا۔

”آ۔۔۔۔۔؟“ فرح نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

”میں آ گیا ہوں۔ تمہیں لینے کے لئے۔ ایم سوری میں نے تمہیں تب نہیں روک لیا جب تم یہ شہر چھوڑ رہی تھی۔ مجھے معاف کر دو میں نے تب کچھ نہیں سمجھا جب میں تمہیں فلیٹ کی طرف چھوڑنے کے لئے جا رہا تھا۔ تمہارے لئے میرے دل میں محبت کا دیار روشن ہو گیا تھا لیکن اس کی روشنی محسوس کرنے میں مجھ سے دیر ہو گئی۔“ عاشرا اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”کیا تم میرے ساتھ چلو گی۔ میری زندگی میں ہر پل میرے ساتھ جینے کے لئے۔؟“

فرح کی آنکھوں سے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ دادی اماں پاس ہی بیٹھی ان کی جانب متوجہ تھی۔ اچانک شیردل کی دھاڑ سنائی دی۔

”کون ہو تم۔۔۔ اور یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔؟“

عاشرا نے شیردل کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ عاشرا اس کے پاس گیا۔ اور بولا۔ ”چوہدری الطاف کون ہے۔؟“

”چوہدری الطاف یہ ہیں۔“ ایک ملازم نے فوراً اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

عاشرا اس کے پاس چلا گیا۔ ”میرا نام عاشرا ہے۔ میں فرح کو لینے کے لئے آیا ہوں۔“

”تم فرح کو لینے کے لئے آئے ہو۔؟ کیوں۔؟“ چوہدری الطاف نے پوچھا۔

”میں اُسے لے جا رہا ہوں۔“ عاشرا نے اس کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

”فرح کا ابھی میرے بیٹے شیردل سے نکاح ہو رہا ہے۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ میں اسے

لے جانے کے لئے آیا ہوں۔ ہو کون تم۔“ چوہدری الطاف نے کہا۔

”ان کا نام عاشرا ہے۔ یہ شہر کے ایک بہت بڑی انڈسٹریل فیملی سے تعلق رکھتے

ہیں۔ فرح ان کے خاندان کی بہو بن رہی ہیں۔“ خاور نے آگے بڑھ کر کہا۔

”ہوش میں تو ہو تم۔ گولیوں سے بھون دوں گا جو ایسی بات کی۔“ شیردل نے آگے بڑھ

کر جوش سے کہا۔ اس کے بھائی بھی عاشرا کے ارد گرد کھڑے ہو گئے تھے۔ فرح پریشان ہو گئی تھی۔

عاشرا نے سب کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”یاد رکھو میرا تعلق جس خاندان سے ہے وہ میرے جسم پر آیا ہوا ایک چھوٹا سا زخم کا نشان بھی برداشت نہیں کریں گے۔ آزمانا چاہو تو میں تمہارے



سامنے کھڑا ہوں۔ پھر دیکھ لینا اس گاؤں میں ایسا طوفان آئے گا سارا گاؤں تم لوگوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔“

عاشر کی یہ بات کام کر گئی تھی۔ چوہدری الطاف اس گاؤں کے لوگوں سے بچہ لڑا سکتا تھا، اُن لوگوں کو لڑا سکتا تھا جن کے بارے میں اسے علم ہوتا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن عاشر کا بے خوف لہجہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ کوئی عام نہیں ہے۔ اس لئے اس نے پھر مصلحت سے کام لیا۔ اور اپنی کھوپڑی استعمال کرنے کی سوچی۔

”اوٹھو... کوئی بیچ میں نہ آئے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“ چوہدری الطاف نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ سب پیچھے ہٹ گئے۔ چوہدری الطاف اپنی جگہ سے اُٹھ کر عاشر کے پاس جا کر بولا۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

”فرح کو لے جانا چاہتا ہوں۔“ عاشر نے کہا۔

”اور اگر ہم نہ لے جانے دیں تو؟“ چوہدری الطاف نے کہا۔

”لینے کے لئے آیا ہوں لے کر جاؤں گا۔“ عاشر نے مصمم ارادے سے کہا۔

”ٹھیک ہے لے جاؤ۔ یہاں تم پر کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ لیکن اگر اس حویلی سے باہر قدم رکھتے ہی کوئی باہر کا بندہ تم پر گولی چلا دیتا ہے تو پھر ہم پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ تم ہمارے خلاف پھر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ تمہاری لڑائی اس حویلی سے باہر ہوگی۔ کن کے ساتھ مجھے بھی نہیں پتہ۔ لیکن میرا کوئی بیٹا اس لڑائی میں شامل نہیں ہوگا۔ بولو منظور ہے؟“ چوہدری الطاف نے اپنا دماغ لڑا کر کہا۔

”مجھے منظور ہے۔“ عاشر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس حویلی کے اندر سے مجھ پر کوئی حملہ ہوا تو پھر نہ یہ حویلی رہے گی اور نہ حویلی والے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس حویلی کے اندر تم پر کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ باہر کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے۔ اور اگر تم اسے نہ لے جا سکتے تو پھر تم خالی ہاتھ لوٹ جاؤ گے۔“ چوہدری الطاف نے کہا۔

”مجھے منظور ہے۔“ عاشر نے کہا۔ خاور اسے ایک طرف لے گیا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو۔ اس کی چال سمجھنے کی کوشش کرو۔“

عاشر نے اس کا جواب دینے کی بجائے اپنے ڈرائیور کو فون کر کے حکم دیا کہ وہ اس گاؤں سے چلا جائے۔ فرح بھی حیران تھی اور چوہدری الطاف اپنے بیٹوں کے ساتھ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبا عظیم ہسپتال کے بیڈ پر زخمی حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر چوٹیں آئی تھیں لیکن ایسی نہیں تھیں کہ اسے بیڈ پر ایک لمبے عرصے کے لئے رہنا پڑتا۔ البتہ خون زیادہ بہہ گیا تھا۔ ایمر جنسی حالت میں جب ابھی اس کے گھر والے ابھی نہیں آئے تھے اور ہسپتال کی ڈاکٹر شائستہ اسے جانتی تھی اس نے خون فوراً مہیا کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کر دی تھی۔ اس کے گروپ کا خون اتفاق سے ہسپتال کے چپڑاسی سے ملا تھا۔ وہ خون اس کے جسم میں منتقل ہو چکا تھا۔ ہوش آنے پر اسے نادیہ نے یہ بات اسے بتائی تھی۔

جب اس کی حالت مزید سنبھلی تو اس نے آفتاب سے ملنے کے لئے کہا۔ آفتاب کو اس کے حادثے کی اطلاع اب مل رہی تھی۔ وہ اس وقت علی کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ اس نے گاڑی کا رخ ہسپتال کی طرف موڑ دیا۔ وہ بھاگتا ہوا اس کمرے تک گیا جہاں صبا لیٹی ہوئی تھی۔ آفتاب کو دیکھتے ہی صبارو نے لگی۔ آفتاب نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”یہ کیا ہو گیا ہے۔“

”آفتاب مجھے معاف کر دو۔“ وہ بولی،

”کس بات کے لئے؟“ آفتاب نے کہا۔

”میں نے تمہیں دکھ دیا۔“ وہ بولی۔

”نہیں تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا صبا۔“

”میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“

”میری بھی ایسی ہی حالت ہے۔“

دھڑکن

”میں اس بنگلے میں نہیں رہوں گی۔ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اس گھر میں رہوں گی۔ علی ہمارے ساتھ رہے گا۔ تم مجھے مت چھوڑو۔ میں تمہارے لئے اپنے آپ کو بدل لوں گی۔ اپنا آپ بدل لوں گی۔ پلیز مجھے مت چھوڑو۔“ صبا رونے لگی تھی۔ آنسوؤں میں نہ جانے کیا کیا بہہ کر نکل رہا تھا۔

”جب تم میرے لئے اپنے آپ کو بدل رہی ہو تو میں تجھے کیوں چھوڑوں گا۔ پیسہ تو میں سڈنی میں رہ کر بھی کما سکتا تھا لیکن یہاں تو میں تمہارے لئے آیا تھا۔“ آفتاب نے کہا۔ ”تمہارے لئے میں نے سڈنی چھوڑا تھا۔ ورنہ وہاں کیا نہیں تھا۔“

”اب مجھے چھوڑو گے تو نہیں؟“ صبا نے روتے ہوئے پوچھا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ آفتاب نے کہا۔

صبا نے علی کی طرف دیکھا اُسے اپنے پاس بلالیا اور اس کا ماتھا چوما۔ وہ بدل گئی تھی۔ وہ آفتاب کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اور جب اسے یہ پتہ چلا تھا کہ ایک معمولی آدمی کا خون اس کے جسم میں اس کے خون کے ساتھ دوڑ رہا ہے تو اس نے سوچا کہ خون کا رنگ ایک ہے تو پھر کسی انسان کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

آفتاب تو خوش تھا ہی لیکن صبا کی خوشی قابل دید تھی۔

☆.....☆.....☆

چوہدری الطاف اپنی چال بازی میں مشہور تھا۔ وہ اپنی باتوں کے حصار میں دوسرے آدمی کو لے ہی آتا تھا۔ سامنے اس سے زیادہ طاقت ور کھڑا ہو تو اس سے بندوق یا لالٹھی سے لڑائی کی بجائے دماغ کی مار دینا اس کا اصول تھا۔ وہ سب اطمینان سے بیٹھ گئے تھے۔

عاشر نے دادی اماں کے پاس جا کر کہا۔ ”آپ چلیں گی ہمارے ساتھ؟“

”بیٹا تم اس کی چال میں آ گئے ہو۔ اس حویلی کے گیٹ کے باہر اس کے پالتو کتے پھر رہے ہیں۔“ دادی اماں نے کہا۔

”آپ ہمارے ساتھ چلیں گی؟“ عاشر نے پوچھا۔

دھڑکن

”میں یہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ اس کے دادا کی یہاں قبر ہے۔ اس کے ساتھ اپنی قبر بنوانا چاہتی ہوں۔ میری پوتی کو یہاں سے لے جاؤ۔ لیکن کیسے....“ دادی اماں پھر پریشان ہو گئی۔

”دیکھو یہ ٹھیک ہے کہ بندہ پیار میں اندھا ہو جاتا ہے لیکن اتنا بھی اندھا ہونا کیا کہ بندہ گولی کی پرواہ ہی نہ کرے۔“ عاشر نے کہا۔

”تم گولی سے ڈرتے ہو؟“ خاور نے پوچھا۔

”مجھے تمہاری فکر ہے اور تم نے ڈرائیور کو بھی بھیج دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔“ خاور نے کہا۔ وہ پریشان تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”چوہدری الطاف ٹھیک کرے گا کیا؟“ خاور نے کہا۔

ٹھیک اسی وقت ایک ہیلی کاپٹر فضا میں اڑتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے دو تین چکر لگائے وہ زیادہ اونچائی پر نہیں تھا۔ عاشر نے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ ہیلی کاپٹر اور نیچا ہوا چوہدری الطاف سمیت سب ہی دیکھنے لگے۔ ہیلی کاپٹر اور نیچا آیا اور حویلی کے احاطے میں اتر گیا۔ مٹی اور دھول ایسی اڑی کہ جیسے آندھی آگئی ہو۔

کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھلا اور فیاض احمد باہر نکلا۔ چوہدری الطاف کیا اس کے بیٹے بھی حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

”شکر کرو تمہارے آغا انکل کہیں گئے نہیں تھے اور یہ ہیلی کاپٹر مل گیا۔“ فیاض احمد نے عاشر سے کہا۔

”آپ ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔“ عاشر نے کہا۔

”اب چلنا ہے کہ کوئی بات بھی کرنی ہے۔“ فیاض احمد نے چوہدری الطاف اور اس کے بیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس ہم چلیں گے۔“ عاشر نے کہا۔ دادی اماں سے اجازت لی۔ فرح کا ہاتھ پکڑا اور ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔ شیردل غصے سے اپنی جگہ سے اٹھا کہ اسی اثنا میں چوہدری الطاف نے

اس کا بازو پکڑ کر آہستہ سے کہا۔

”جانے دو۔ بھول جاؤ۔ جو ایسا کر سکتے ہیں وہ ہمارے کسی قدم کا کیا جواب دیں گے وہ سوچو۔“

سب ہیلی کا پٹر میں بیٹھ گئے تھے۔ ہیلی کا پٹر کا پنکھا گھوما وہ اٹھا اور فضا میں تیرنے لگا۔ دادی اماں حویلی کے گیٹ سے نکل کر مسرت میں ڈوبی ہوئی اپنے گھر کی طرف جارہی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ سامنے سے بھاگتی ہوئی دو لڑکی آئی۔ وہ اس سے پوچھنے لگی اور دادی اماں خوش خوش اُسے بتانے لگی۔

☆.....☆.....☆

نگہت بیگم کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جسے وہ دوبار پڑھ چکی تھی۔ وہ ایک شخص کی جانب سے عدالتی نوٹس تھا۔ جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ اس نے نگہت بیگم کے شوروم سے ملحق جگہ خریدی تھی۔ نگہت بیگم نے اس سے وہ جگہ کرائے پر حاصل کر کے اپنی جگہ کے ساتھ شامل کر لی تھی۔ جو کرایہ اس سے طے ہوا تھا وہ تین سال سے ادا نہیں کیا گیا ہے۔ کرائے کے ساتھ ساتھ وہ جگہ بھی دلانے کی درخواست کی گئی تھی۔

نگہت بیگم پریشان ہو گئی تھی۔ اچانک کا شان اور سبینا آ گئے۔ کا شان نے پوچھا۔  
”کیا ہوا ماما؟“

”تم اس وقت۔۔۔ آفس سے جلدی آ گئے ہو۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں کام تھا اس لئے آ گیا۔“ کا شان نے بتایا۔

”آپ پریشان ہیں کیا بات ہے۔“ سبینا نے پوچھا۔

”یہ اپنے بھی ساتھ بیٹھ کر وار کرتے ہیں۔ اور ایسے طریقے سے کہ چھری گھونپتے ہوئے پتہ بھی نہیں چلنے دیتے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

”کیا ہوا کیا ہے۔“ کا شان نے پوچھا۔

نگہت بیگم نے وہ کاغذ کا شان کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذ پڑھ کر کا شان نے کہا۔ ”آپ بھی کیس کر دیں اپنے وکیل کے مشورے سے۔ بات عدالت کی فائلوں میں الجھ جائے گی۔“  
”میں اس سے بھی کچھ بڑھ کر کروں گی۔“ نگہت بیگم نے دانت پیس کر کہا۔  
”کیا کرنے کا ارادہ ہے ماما۔“ اچانک اولیس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ منابل بھی تھی۔

”تم بھی آ گئے ہو۔ کیا بات ہے۔ آفس سے اتنی جلدی آ گئے۔؟“ نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔

”کام تھا ماما۔“ اولیس نے بتایا۔

”کیسا کام تھا کہ دونوں گھر آ گئے ہو۔“ نگہت بیگم نے دونوں کا جائزہ لیا۔

”مما یہ کیا ہے۔؟“ منابل نے کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم بھی پڑھ لو۔“ نگہت بیگم نے کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اولیس اور منابل نے کاغذ پڑھ کر ماما کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی کیس کر دیں۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“

”کیسا ہی ہوگا۔؟“ فیاض احمد نے دروازے پر پہنچتے ہی کہا۔

نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”تم بھی آ گئے ہو۔ تمہیں بھی کام ہے۔؟“  
”یہ بھی آ گئے ہیں۔ مجھے کیا کام ہو سکتا ہے۔ میں کمپنی کا چیئر مین ہوں۔ جب چاہوں

آ جاؤں اور جب چاہوں چلا جاؤں۔“ فیاض احمد نے کہا اور اس کے پاس جا کر خود ہی وہ کاغذ ہاتھ سے لیا اور پڑھنے لگا۔

”تم کیا کہتے ہو۔؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”کس بارے میں۔؟“ فیاض احمد نے کہا۔

”اس نوٹس کے بارے میں۔ مجھے کیا کیس کر دینا چاہیے۔“ نگہت بیگم نے اس کی طرف

دیکھتے ہوئے پوچھا۔

دھڑکن

”کیس کرنے سے بھی پہلے تمہیں ایک بات یاد رکھنی چاہئے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”وہ کیا؟؟“

”وہ یہ کہ جو تمہاری اولاد تمہاری بہویں ان کے بچے تمہارا خیال رکھ سکتے ہیں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتے ہیں ایسی اُمید تم کسی دوسرے سے نہیں کر سکتی ہو۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”کیا مطلب؟؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ اس چھت کے نیچے تمہاری اولاد ان کی بیویاں ان کے بچے ہی تمہارے اور میرے اصل دوست اور ساتھی ہیں۔ ان کی خوشیاں ہماری خوشیاں ہیں۔ ان کی خوشی کے ساتھ ہمیں جینا ہے مرنا ہے۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”تو میں نے کب کہا کہ ایسا نہیں ہے۔“ نگہت بیگم بولی۔

”تم بھی ایسا ہی سوچتی ہو۔“ فیاض احمد نے پوچھا۔

”ہاں میں بھی ایسا ہی سوچتی ہوں۔ اور کیا میں ایسا نہیں سوچ سکتی۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

فیاض احمد نے جلدی سے کہا۔ ”تو پھر ٹھیک ہے۔ اب تم جلدی سے بغیر کچھ کہنے سے

اپنے اس بچے کی خوشی کو بھی اپنی خوشی سمجھ لو۔“

اس کے ساتھ ہی فیاض احمد نے منائل کو اشارہ کیا۔ وہ باہر گئی اور کچھ ہی دیر بعد عاشر اور

فرح کو اپنے ساتھ لے آئی۔ فرح کو دیکھتے ہی نگہت بیگم کا منہ بن گیا۔ فیاض احمد نے فوراً کہا۔

”دیکھو ابھی تم نے کہا تھا کہ تم بھی اپنے بچوں کی خوشی کے ساتھ جینا اور مرنا چاہتی ہو۔“

”لیکن.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن کچھ نہیں۔“ فیاض احمد نے اسے روک دیا۔

”لیکن.....“ نگہت بیگم نے پھر بولنا چاہا۔

”لیکن کوئی سوال نہیں۔“ فیاض احمد نے جیسے ضد کی ہو۔

نگہت بیگم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مجھے اپنے کمرے میں جانا ہے۔“

”دیکھو فرح بہت اچھی لڑکی ہے۔ عاشر کے بھائیوں اور اس کی بھابیوں نے اسے قبول

دھڑکن

کیا ہے اور دل سے قبول کیا ہے۔ اس چھت تلے ہم سب کو خوش رہنا ہے ایک دوسرے کو خوش رکھنا ہے میں کبھی تمہارے گھر کے معاملے میں نہیں بولا آج پہلی بار بولا ہوں تو میرے بولنے کا مان رکھ لو۔“ فیاض احمد نے کہا۔

”مجھے اپنے کمرے میں جانا ہے۔“ نگہت بیگم نے کہا اور پھر کسی کی سنے بغیر وہ اس جگہ سے چلی گئی۔ سب دیکھتے ہی رہ گئے۔ اسی اثنا میں خاور نے جھانک کر کہا۔

”مجھے بھی اندر آنے کی اجازت ہے۔“

”تم بھی آ جاؤ۔ کچھ نہیں ہوا۔“ عاشر نے کہا۔

”انکل میں بات کروں۔“ خاور نے کہا۔

”عاشر کی ماما سے۔“ فیاض احمد نے اس کی طرف دیکھا۔

”نن.... نہیں اپنے گھر اس فون سے کہ میں آ گیا ہوں۔ دراصل میرا موبائل بیٹری لو

ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا ہے۔“ خاور نے کہا۔

”تمہیں فون کی پڑی ہوئی ہے اور یہاں میری زندگی منجھدار میں کھڑی ہے۔“ عاشر

نے کہا۔

”میرے فون نہ کرنے سے کیا تمہیں کنارہ مل جائے گا۔“ خاور نے کہا۔

ٹھیک اسی وقت نگہت بیگم اندر آ گئی۔ سب نے حیرت سے نگہت بیگم کی طرف

دیکھا۔ اس نے پاس جا کر سب کا جائزہ لیا اور بولی۔

”تم سب ملے ہوئے ہو۔“

”تم بھی مل جاؤ نا۔“ فیاض احمد نے کہا۔

نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”سچ کہا ہے تم نے فیاض احمد۔“ نگہت بیگم

نے کہا۔ وہ عاشر کے سامنے چلی گئی۔ اسے دیکھا اور ہاتھ سے ایک طرف ہٹا دیا۔ پھر اس نے

فرح کو دیکھا۔ اچانک اس کی نگاہ خاور پر پڑی۔ اس کی طرف دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”یہ کون ہے۔؟“

”یہ خاور ہے ماما۔“ عاشر نے بتایا۔



”خاور کون۔؟“ نگہت بیگم نے پوچھا۔

”عاشر نے میرے بارے میں بتایا ہے۔“ خاور نے جلدی سے کہا اور مسکرایا۔

”یہ میرا دوست ہے۔ بہت ہی اچھا ہے۔ ہماری دوستی کالج کے زمانے سے ہے۔ یہ

ایک محلے میں رہتا ہے۔“ عاشر نے مزید بتایا۔

”اوہ....“ نگہت بیگم نے عاشر کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ وہی ہے جس نے تجھے امی کہنا

سکھایا تھا۔؟“

”ہاں یہ وہی ہے۔ وہ گھاس اور شیر والی بات۔“ عاشر نے جیسے یاد دلایا ہو۔

نگہت بیگم نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”تم سے میں بعد میں بات کرتی ہوں۔“

”تب تک میں جاؤں۔؟“ خاور نے گھبرا کر کہا۔

”تم ابھی کہیں نہیں جاؤ گے۔“ نگہت بیگم نے کہا۔

نگہت بیگم ایک بار پھر فرح کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے فرح کی طرف دیکھا۔ فرح کچھ

گھبرائی۔ اس نے آنکھیں چرائیں۔ نگہت بیگم نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور بولی۔

”خوش رہو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی وہی انگلی

جو وہ صبا کے لئے لائی تھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ سب نے تالیاں بجائیں۔۔۔ سب کے

چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔

عاشر نے اپنی ماں کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ نگہت بیگم نے خاور کو بھی ہمیشہ اس گھر میں

آتے جاتے رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ سب ہی خوش تھے لیکن سب سے زیادہ خوش.....

عاشر اور فرح تھے..... دونوں کو حقیقی خوشی ملی تھی۔

